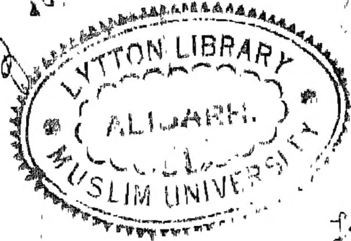
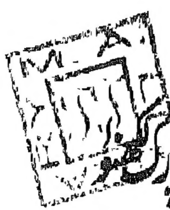
دورِ جدید

کے

چند منتخب ہندو شعراء

عبد الشکور ایم اے





کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

۱۹۴۳ء

ناشر

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

پہلی بار

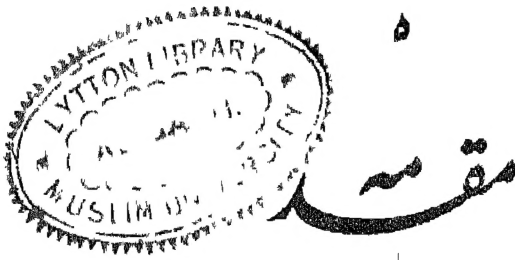
قیمت تین روپے



فہرست

صفحہ				نمبر شمار
۵			مقدمہ	۱۔
۴۳			دورِ جدید کے آنجہانی ہندو شعراء	۲۔
۴۵	سنہ ۱۹۱۲ء	لغایت سنہ ۱۸۴۶ء	سرشار	
۴۸	سنہ ۱۹۱۱ء	″ سنہ ۱۸۶۳ء	برق (جوالا پرشاد)	
۵۰	سنہ ۱۹۲۰ء	″ سنہ ۱۸۶۴ء	شاد	
۵۳	سنہ ۱۹۲۳ء	″ سنہ ۱۸۶۶ء	نظر	
۵۸	سنہ ۱۹۱۰ء	″ سنہ ۱۸۷۳ء	سرور	
۶۶	سنہ ۱۹۲۶ء	″ سنہ ۱۸۸۲ء	چکبست	
۷۴	سنہ ۱۹۳۶ء	″ سنہ ۱۸۸۴ء	برق (مہاراج بہادر)	
۷۷	سنہ ۱۹۲۱ء	″ سنہ ۱۸۸۸ء	ریش	
۸۱	سنہ ۱۹۳۴ء	″ سنہ ۱۸۸۹ء	رواں	
۸۷			عصرِ حاضر کے ہندو شعراء	۳۔
۸۸		سنہ ۱۸۶۳ء	ساحر	
۹۳		سنہ ۱۸۶۳ء	شوق	
۹۶		سنہ ۱۸۶۶ء	کیفی	

نمبر شمار	
ناشاد	سنہ ۱۸۸۱ء
جوش	سنہ ۱۸۸۲ء
محروم	سنہ ۱۸۸۵ء
وحشی	سنہ ۱۸۸۶ء
جگر	سنہ ۱۸۹۰ء
اندرجیت شرما	سنہ ۱۸۹۳ء
وفا	سنہ ۱۸۹۴ء
فراق	سنہ ۱۸۹۶ء
ملا	سنہ ۱۹۰۱ء
قیس	سنہ ۱۹۰۴ء
فرحت	سنہ ۱۹۰۵ء
مدہوش	سنہ ۱۹۰۶ء
عرش	سنہ ۱۹۰۸ء
بیتاب	سنہ ۱۹۱۰ء
تاجور	سنہ ۱۹۱۷ء
سحر	
منور	
قمر	
بسمل	



مقدمہ

اُردو زبان اور ادب کی موجودہ صورت و ہیئت کو دیکھ کر خواہ مخواہ یہ
غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اُردو زبان فارسی زبان کی شاخ ہے، یہ غلط فہمی کسقدر
مہلک اور تکلیف دہ ثابت ہوئی، اس کا اندازہ اس زمانے میں ہوتا ہے جب ملک
میں عام طور سے یہ یقین پھیل گیا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی خالص
ہندوؤں کی ملکیت ہے، اس یقین نے جو ایک اندوہناک غلط فہمی کا نتیجہ ہے سیاسی
آب و رنگ سے ملوث ہو کر ملک کے سامنے ایک ایسی پیچیدگی کی خوفناک صورت
اختیار کر لی ہے جو کسی عنوان نہیں سلجھ پاتی، مہذب و تعلیم یافتہ حلقوں میں یہ یقین
اور زیادہ راسخ اور یہ عقیدہ اور زیادہ مستحکم پایا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بہتر سے بہتر
واقفیت رکھنے والے برادرانِ وطن نہ زبانِ اردو کے ماخذ پہ غور فرماتے ہیں، نہ
اس زبان کی تاریخ اور ساخت کی جانچ پرتال کرتے ہیں، بلکہ تعصب کے ایک سیلابِ عظیم
میں بہے چلے جاتے ہیں۔ اسپر غور نہیں فرماتے کہ جس زبان سے ہم آج منھ موڑ رہے ہیں وہ
ہمارے ہی خاندانوں میں پلی، بڑھی اور بڑھ کر جوان ہوئی۔ جس زبان کی بنیادیں
آج ہم کھوکھلی کرنے پر اُڑے ہیں، اسی زبان میں ہمارے آبا و اجداد، ہماری مائیں
اور ہماری بہنیں اپنے جذبات، اپنے نظریات اور اپنے خیالات بیان کرتے تھے اور
اور اس لطیف اور پاکیزہ ورثہ کی ترقی و توسیع کو اپنا اوّلین فرض سمجھتے تھے۔

اس زمانے میں ہمارا بدنصیب ملک ایک المناک اور حوصلہ شکن دور سے
گذر رہا ہے۔ ہر شے فرقہ وارانہ سیاست کی کسوٹی پر پرکھی جا رہی ہے۔ فرقہ وارانہ جذبات کا
اشتعال انتہائی بلندی پر پہونچ چکا ہے۔ رواداری اور وسعت نظر کا کوسوں پتہ نہیں
شبہات، توہمات اور تعصبات کا زور شور ہے۔ آپس کا میل ملاپ ختم، آنا جانا، صاحب

سلامت مفقود، صاحب سلامت ہوئی بھی تو سراسر رسمی، محض دکھاوا، دلوں میں کھوٹ، نیتوں میں فتور، ارادوں میں انتقام اور منصوبوں میں شرارت و فساد، گو بظاہر ہو کہ ہم سب ایک ہی سرزمین کی پیداوار ہیں، ایک ہی آسمان کے تلے بستے ہیں، مگر جنگ سیاست نے دل مجروح اور قلب ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ طوفان بدتمیزی کب فرو ہوگا اور گرد و غبار کے یہ گہرے گہرے بادل کب چھٹ جائیں گے۔ اردو ہندوستان کی آبادی کا ایک واحد اور مقدس ورثہ ہو جو ہمیں اپنے اجداد سے حاصل ہوا ہو۔ یہ وہ زبان ہو جس میں ہمارے ملک کی تہذیب، شائستگی، علوم و فنون، اور ہمارے بزرگوں کے جذبات عالیہ اور معتقدات مقدسہ محفوظ ہیں۔ اُمید تھی کہ یہ مشترکہ زبان ہم میں یگانگت، رفاقت اور اخلاص کا بیج بوئے گی، ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر لائے گی، اس زبان نے یہ خدمت مدتوں بڑے سلیقہ اور محبت کے ساتھ انجام دی، افسوس ہو کہ اس زبان سے اب ہم نے یہ کام لینا چھوڑ دیا ہو، نہ صرف یہ بلکہ خود اس زبان کا مسئلہ ہمارے اختلافی مسائل میں خاص طور سے وجہ مخاصمت اور سبب منافرت بن گیا ہو۔

آج سے پچیس تیس برس پہلے ہندو اور مسلم افراد اور خاندانوں میں میل و محبت کا محیط تھا، پُرخلوص ملاقاتیں، تہواروں میں شرکت، غم و شادی میں اتحاد، عورتوں کا آنا جانا، بچوں میں محبت و یک جہتی ایک عام بات تھی، ہمیں خود اپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد ہو کہ ہمارے بزرگوں سے ان کے ہندو احباب ملنے آتے تھے اور یہ ملاقاتیں انتہا سے زیادہ خلوص اور محبت سے لبریز ہوتی تھیں۔ مگر اب وہ دیرینہ نقوش سراسر کالعدم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو سے مسلمان کی ملاقات دفتر، اسکول، کالج، ٹریم، کھیل کے میدان اور اسٹیشن پر تو ہو سکتی ہو لیکن ہندو مسلمان کا بحیثیت دوست کے ایک دوسرے کے مکان پر آنا ایک امر محال ہو گیا ہو۔ نہ وہ ملاقاتیں ہیں نہ وہ صحبتیں ہیں دلوں میں منافرت کے جذبات موجزن ہیں، قلوب میں حقارت کے احساسات موجزن ہیں، ملنا ہو تو کیسے؟ اور ملاقات کی صورت نکلے تو کیونکر؟ انھیں تاثرات کو

ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"اس غلطی کی بنا پر عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اس غلط فہمی سے ایک عرصہ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معاونین اردو اور طرفداران ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی و نیز ان کی استعداد و قبولیت عامہ کی نسبت چلا آتا ہے اور ایک معمولی بات یعنی اردو زبان کی اصل کو نظر انداز کرتے جاتے ہیں[1]۔"

اس مقابلہ اور مباحثہ کی ابتدا کب سے ہوئی؟ اس کا تذکرہ آگے کیا جائیگا اس وقت تو صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ جن خاندانوں کے بزرگ فارسی سے عشق رکھتے تھے اور اپنی مادری زبان سمجھ کر اردو کی خدمت کرنا اپنا اہم ترین فرض تصور کرتے تھے انھیں خاندانوں میں آج اس زبان کے خلاف بغاوت، منافرت اور حقارت کے جذبات مشتعل ہو رہے ہیں، اور انھیں خاندانوں کے افراد آج اپنی مادری زبان کو کچلنے اور فنا کر دینے میں دشمنان اردو کے قائد اور مخالفین اردو کے رہبر بنے ہوئے ہیں۔

کسی بالغ نظر سخنور کے لئے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ زبان ہے، اسکی حلاوت اور شیرینی ہر فرد کو یکساں طور پر اپنا گرویدہ بنا چکی ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، آج اس کو وہ قبولیت عام عطا ہوئی ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں اس کا سکہ جاری ہے، اور اس کے نام لیوا ملک کے دور دراز حصوں میں بھی نہایت خلوص اور تندہی کے ساتھ اس کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ اس تعصب اور اختلاف کے زمانہ میں بھی اس زبان کے پجاری ہندو مسلمان سکھ عیسائی اور پارسی ہر قوم ہر ملت اور ہر مذہب کے لوگ موجود ہیں، کیا قیامت ہے زبان پر مذہب کی قید عائد کی جائے! کیا ستم ہے کہ ایک ملکی زبان کو ایک مخصوص

[1] رام بابو سکسینہ صفحہ ا

ملت سے نامزد کرکے اس کی وسعت کو تنگ اور اس کی ترقی کو مسدود کرنے کی کوشش کی جائے!

اردو کس طرح عالم وجود میں آئی، اس کی عہد بہ عہد کی ترقی، اس کے ارتقائی مدارج، اس کی نثر، اس کی نظم، اور اس کے ڈرامہ پر ہم کو نظر ڈالنی ہوگی، یہ بتانا ضروری ہو کہ اس زبان کی ترقی کے ہر دور میں ہندوؤں نے کیا خدمات انجام دیں اور کس محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس زبان کی خدمت میں منہمک رہے۔ ہم ان اوراق میں صرف شاعری کا تذکرہ کریں گے، اسی وجہ سے اس کا نام "اردو کے ہندو شعرا" رکھا گیا ہو۔

ملک میں عام طور سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہو کہ اردو برج بھاشا کی بیٹی ہو اور شاہجہاں صاحبقراں کے عہد میں عالم وجود میں آئی۔ حقیقت یہ ہو کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ تو اردو برج بھاشا کی بیٹی ہو اور نہ صاحبقراں موصوف کے زمانہ میں اس کی تشکیل ہوئی۔ زبان کا عالم وجود میں آنا ایک نہایت دیر طلب کام ہو ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہو
بڑی مشکل سے ہوتا ہو چمن میں دیدہ ور پیدا[1]

ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہو اس کا شاید مفہوم یہ ہو کہ عہد شاہجہانی میں جہاں ہندوستان کو آرٹ فن کاری اور ادب کے بہت سے شہ پارے حاصل ہوئے اسی طرح ایک شہ پارہ اردو بھی ہو جو اس عہد میں پیدا ہوئی، اور بڑھتے بڑھتے آج اس درجہ کو پہنچی کہ دنیا کی ادبی زبانوں سے ہمسری کا

[1] دونوں قوموں نے اس میل ملاپ کے ذریعہ کو پیدا کر لیے، ترقی دینے اور پھیلانے میں صدیاں گذاری ہیں اور نسلیں بیتی ہیں تب کہیں جاکر یہ مقصد حاصل ہوا ہو۔ آریوں نے اپنی سنسکرت، عربوں نے اپنی عربی، ترکوں نے اپنی ترکی، مغلوں نے اپنی فارسی اور پٹھانوں نے اپنی پشتو بھلا کر یا ملا کر اس زبان کا توام تیار کیا۔ (لطوش سلیمانی)

دعویٰ کرنے لگی۔ زبان کی پیدائش کے لئے کم از کم پندرہ بیس نسلوں کی محنت اور جگر کاوی درکار ہے۔ چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ شاہجہاں کے عہد سے تقریباً چار سو پانچ سو برس پہلے اردو زبان کی بنا پڑی[1] اور اس طویل عرصہ کی لگاتار تمدنی اور معاشرتی جدوجہد کے بعد اردو نے ایک ادبی زبان کی پہلی منزل میں قدم رکھا۔

فیلن[2] اپنی کتاب "طبقات الشعراء" میں لکھتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کے قبل تمام ہندوستان میں ویدک زبان کے خلاف ایک اور زبان مروج تھی اور راجہ بھرت کے عہد حکومت میں بھاشا کو فروغ حاصل ہوا، ہنوز بھاشا نشوونما کی حالت میں تھی کہ محمود غزنوی نے ہند پر متواتر حملے شروع کئے حتیٰ کہ بارھویں صدی میں پٹھانوں نے

---

[1] پروفیسر اویس احمد صاحب ادیب نے اپنے مقالہ "اردو زبان کی نئی تحقیق" میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اردو آریوں کے ساتھ ہندوستان آئی تھی، جو زبان وہ بولتے تھے لشکر کی زبان ہونے کی حیثیت سے وہ اردو تھی۔ چنانچہ مصنف "اردو زبان کی نئی تحقیق" کے خیال کے مطابق اردو اس وقت سے ہندوستان میں بولی جاتی تھی جبکہ پہلی بار شمالی مغربی دروں سے آریہ قوم وارد ہند ہوئی تھی۔

[2] فیلن کے خیال کے مطابق "اردو" کی بنیاد محمود غزنوی کے متواتر حملوں کے دوران میں پڑی تھی، جبکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہم ملنے جلنے اور گفت وشنید کرنے کے موقع ملے مگر مصنف "اردو زبان کی نئی تحقیق" کے خیال کے مطابق "اردو" کی بنیاد اُس وقت سے ہندوستان میں پڑی ہے جبکہ آریہ قوم نے سرزمین ہند پر قدم رکھا اور کول بھیل اور دراوڑ جیسی سیاہ جلد والی اقوام سے جنگ کرکے ان کو شکست دی اور ان کو اپنا غلام بنا لیا۔ اسوقت ان غلاموں سے جو گفتگو ہوتی تھی وہ گفتگو اردو زبان موجودہ "اردو" کا سنگ بنیاد بنی کیونکہ آریہ اور ہندوستان کی قدیم اقوام اپنے مطالب ایک دوسرے کو سمجھانے کی غرض سے ایک دوسرے کی زبانیں استعمال کرتے تھے۔ جب فیلن نے یہ لکھا ہے کہ اردو دو قوموں کے میل جول کا نتیجہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس نے اس کو صرف "مسلمانوں اور ہندوؤں" کے میل جول تک ہی محدود کر دیا ہے یہاں تو صرف دو قومیں ہیں اور قدیم زمانے میں کئی اقوام تھیں یعنی آریہ، کول، بھیل، دراوڑ وغیرہ، ان کے میل جول سے جو زبان پیدا ہوئی وہ موجودہ اردو کا سنگ بنیاد بنی۔

ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی اور اقتضائے وقت کے بموجب دو اجنبی قوموں کے درمیان بات چیت، لین دین، اور دوسرے معاملات کے افہام اور تفہیم کے لئے ایک جدید اور مرکب زبان کی بنیاد پڑی۔"

فیلن کا یہ بیان واقعات کا آئینہ دار ہے، ہر تذکرہ نویس نے اردو کی ابتدا کی یہی صورت بیان کی ہے[1]۔ یہ زبان دو مختلف قوموں کے میل جول[2] کا نتیجہ ہے۔ دو قومیں جو مختلف زبانیں بولتی تھیں جب ایک دوسرے کے ساتھ رہنے بسنے اور زندگی گذارنے لگیں تو ایک تیسری زبان پیدا ہوئی تاکہ روزانہ کی معاشرتی ضروریات پوری ہو سکیں اور دو ہمسایہ قومیں آسانی کے ساتھ زندگی گذار سکیں، اسی سلسلہ میں محمود خاں صاحب شیرانی کا نظریہ قابل توجہ ہے۔

"لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج بھاشا ہے، نہ ہریانی، اور نہ قنوجی ہے، بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور

---

[1] مسلمانوں نے جب اس ملک میں اقامت اختیار کی اور یہیں کے ہو رہے تو وہ اس ملک کے قدیم تمدن سے اس حد تک اثر پذیر ہوئے کہ انھوں نے اپنے ادب، معاشرت اور طرز ماندوبود اور اپنی زبان تک میں ترمیم گوارا کر لی۔ یہاں کے باشندوں نے جب ان کی معقول روش دیکھی تو انھوں نے بھی دل کھول کر اس کی پذیرائی کی اور "کچھ دیجئے اور کچھ لیجئے" کے اصول پر ملک کے لئے ایک ہم آہنگ معاشرت اور ایک ہم آہنگ کلچر کی داغ بیل ڈالی کم و بیش ایک ہزار سال تک یہ عمل جاری رہا اور ایک نئی قوم ایک نیا تمدن ایک نیا کلچر ایک نئی ملکی زبان وجود میں آئی۔

(ہماری زبان صفحہ گیارہ مؤرخہ ۱۶ اگست ۱۹۶۲ء)

[2] "دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا ساجھا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا۔" (نقوش سلیمانی)

"یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی ہے اور ان کی دوستی و محبت کی دائمی یادگار ہے۔ اس یادگار کو مٹانا سیاسی حیثیت سے حد درجہ خطرناک ہے۔"

(نقوش سلیمانی)

میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ مگر راقم کی رائے میں ہریانی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی[۱]۔"

افسوس ہے کہ یہ بیان زیادہ تر قیاس پر مبنی ہے اور پوری وضاحت سے بیان نہیں کیا گیا ہے۔ غالباً اس کا مدعا یہ ہے کہ اردو کی طرح کی کوئی زبان پہلے سے دہلی اور مضافات دہلی میں بولی جاتی تھی جب مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی، اور وہ اس علاقہ میں آباد ہو کر وہاں کی آبادی کا جزو بن گئے تو اس میل جول سے موجودہ اردو کی تعمیر ہوئی اور ابتدائے زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ زبان ترقی کے منازل طے کرنے لگی۔

بہرحال اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اردو کس طرح عالم وجود میں آئی۔ اس زبان کی ابتدا کے زمانہ میں چاہے اختلاف ہو، اس کے ماخذ کے بارے میں چاہے شکوک اور شبہات کی گنجائش ہو، لیکن اس بارے میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ وہ کس طرح پیدا ہوئی۔ اردو کی تعمیر دو قوموں کے میل جول کا نتیجہ ہے، اس لئے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مشترک سرمایہ کے حقدار جبقدر مسلمان ہیں اتنے ہی ہندو ہیں۔ حالانکہ مصنف "اردو زبان کی نئی تحقیق" نے تو اردو کو آریہ قوم کا سرمایہ کہہ دیا ہے۔ پھر بھی یہ کہنا پڑے گا کہ اردو صحیح معنٰی میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا حصہ ہے۔ مسلمان اگر اپنے اس کارنامے پر ناز کر سکتا ہے تو بجا طور سے ہندو کے لئے بھی اس زبان کا وجود وجہ فخر و نازش ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان تو اس کارنامہ پر ناز کرتا ہے اور ہندو اپنے گھر کی اس پیداوار سے ایسا منحرف ہو جائے کہ اس کو تباہ اور برباد کرنے پر کمربستہ نظر آئے، سچ تو یہ ہے کہ اس نوعیت کا ظلم، ایسا ناروا جور و استبداد صرف ہمارے بدنصیب ملک کی سرزمین ہی پر ظہور میں آ سکتا ہے ورنہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کے

---

[۱] پنجاب میں اردو صفحہ (ب)

باشندے اپنی مادری زبان کی جڑوں پر کلہاڑیاں مارتے ہوں اور فرقہ وارانہ جوش و خروش میں عقل و خرد سے اسقدر بے بہرہ ہو گئے ہوں کہ ان کو کھوٹے کھرے کی تمیز باقی نہ رہے۔

اردو کی ابتدا کا حال تو آپنے سُن لیا، زبان پیدا ہوئی اور بولی جانے لگی، آپس کا میل جول بڑھا، دوستیاں اور محبت قائم ہوئی، معاشرتی ضروریات اور منصبی فرائض نے چولی دامن کا سا ساتھ پیدا کر دیا صبح و شام کا ملنا جلنا ضروری ہوا، سیاسی اور ملکی ضروریات کی وجہ سے کافی وقت کے لئے ساتھ ساتھ اُٹھنا، بیٹھنا، کام کاج کرنا روزانہ کا شعار ہو گیا۔ بات چیت اردو میں ہونے لگی، روز بروز اردو مضبوط اور استوار ہوتی چلی گئی۔ لشکر، شکار گاہ اور بازاروں کی بھیڑ بھاڑ سے آگے بڑھ کر اردو سنجیدہ حلقوں اور گھروں میں پہنچنے لگی، شاعر، مطرب، قوال اردو میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگے۔ شائستہ گھروں میں عورتیں اردو بولنے لگیں۔ عالم خیال میں اردو کی ترقی کے اس زمانہ پر نظر کیجئے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اردو کے ارتقا کے اس اولین دور میں ہندوؤں نے اس زبان کی خدمت سے عدم تعاون کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح اردو کی ابتدا ہندوؤں اور مسلمانوں کی سعی کا ثمر ہے اسی طرح اردو کی ترقی کے پہلے دور میں بھی جب وہ صرف گھٹنوں کے بل چل رہی تھی اس صغر سن بچے کو دونوں قوموں نے یکساں تقویت پہنچائی اور یکساں گرمجوشی کے ساتھ اس کو پروان چڑھایا۔

دکن میں اردو زبان کے ابتدائی حصّہ میں ارشاد ہوتا ہے
"تیمور کے زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط اور روزانہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد

ڈالی ہو جسے آج "دکھنی" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں[1]۔"

"جب دکن کا کچھ حصّہ فتح ہو کر سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا تھا تو یہاں بھی آپس کے میل جول سے وہی نتیجہ رونما ہوا جو شمالی ہند میں ہوا تھا[2]"

صرف فرق اسقدر ہو کہ شمالی ہند میں اس کا نام اردو[3] ہوا اور جنوبی ہند میں اسی زبان کو "دکھنی" کہتے تھے، اس زبان کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کی داستان سُن کر یقینًا تعجب ہوتا ہو، بلکہ ہم تو یہ بھی کہنے کی جسارت کریں گے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان اس قدر سرعت کے ساتھ مقبول عام ہوئی ہو، جس قدر تیزی سے اردو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلی۔ اس ہردلعزیزی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ اردو کوئی بدیسی زبان نہیں ہو جو بیرون ہند سے لاکر اس ملک پر مسلّط کردی گئی ہو، بلکہ وہ اسی ملک کی پیداوار ہو، اس لئے اس کا سرعت کے ساتھ پھیلنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہو۔ بعض اصحاب اس زبان کو برج بھاشا کی بیٹی بتاتے ہیں، کچھ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ

"ہریانوی کوئی علٰحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہو، بلکہ وہ پُرانی اردو ہو[4]۔"

اور اس کا بھی دعویٰ کیا جانے لگا ہو کہ

"اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہو

---

[1] [2] "دکن میں اردو" حالانکہ دکن میں "دکنی" کی ابتدا چھٹی صدی عیسوی میں ہو چکی تھی، جبکہ ساحل مالابار پر اہلِ عرب تجارت کی غرض سے آتے تھے۔ انکی گفتگو کا لازمی نتیجہ اردو تھی، مگر اردوئے معلّیٰ نہیں۔ دکن کے فتح ہونے اور سلطنت دہلی میں شامل ہونے سے قبل یہاں ایک ادبی زبان مرتب ہو چکی تھی۔ مصنف "دکن میں اردو" نے دکنی اور اردوئے معلّیٰ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔

[3] اردوئے معلّیٰ نہیں۔ [4] پنجاب میں اردو۔

اور پنجابی و اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں[1]"

اور یہ تو ظاہر ہو کہ

"اسلامی حکومت چونکہ بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہو
اس لئے یہ زبان اسلامی لشکروں اور مہاجروں کے ساتھ
ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہو[2]"

غرض اس زبان کے ماخذ کے بارے میں خواہ کچھ ہی مانا جائے، لیکن اس بارے میں کسی اختلافات کی گنجائش نہیں ہو کہ اس زبان کی ابتدا ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے ہوئی، اور اس کو تیزی کے ساتھ ملک میں ہر دلعزیز بنانے میں دونوں قوموں نے یکساں طور پر حصہ لیا۔

یقینی طور پر کہا جا سکتا ہو کہ ابتدائی زمانہ میں اردو زبان بہت سادہ اور بے تکلف ہوگی۔ اسمیں کسی قسم کا تقل اور تصنع نہ پایا جاتا ہوگا۔ عام لوگوں کی ضروریات آسانی کے ساتھ اس زبان کے ذریعہ پوری ہو جایا کرتی ہوں گی مدتوں یہ زبان صرف بات چیت کے لئے مخصوص تصور کی جاتی تھی۔ اس کی حیثیت ایک بولی تھی۔ خط و کتابت تک اس زبان میں نہ کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں چونکہ مسلمان حکمراں اپنا سکہ جما چکے تھے، اس لئے فارسی رسم الخط اور فارسی تلمیحات بہت جلد اس زبان کا جزو بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ اس زبان کی صورت اس قدر تبدیل ہو گئی کہ وہ فارسی زبان کا چربہ معلوم ہونے لگی۔ چونکہ شاہی دربار اور دفاتر کی زبان فارسی تھی اس لئے اس بلند پایہ زبان کے اتباع کو قابل فخر سمجھا گیا۔ علاوہ ازیں فارسی تراکیب اور الفاظ سننے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے ان کو اپنی زبان میں داخل کر لینا باعث لطف تھا۔ اس زبان کی رعنائی اور چاشنی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا تھا زبان کی شان و شوکت بڑھتی تھی۔ فارسی الفاظ ڈھلے ڈھلائے منجھے منجائے

---

[1] [2] پنجاب میں اردو

ہاتھ آتے تھے جو آسانی کے ساتھ اشعار میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اس لئے فارسی الفاظ بڑی کثرت کے ساتھ اردو کا جزو لاینفک بنتے چلے گئے۔

شاہان دہلی کی زبان فارسی تھی۔ اس لئے فارسی زبان کا علم حصول ملازمت اور قربت دربار شاہی کے لئے نہایت ضروری ہو گیا۔ چنانچہ ہندوؤں نے اس زمانہ میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ فارسی پڑھنا شروع کی اور بہت جلد اس زبان میں مہارت بہم پہونچائی۔ ہندو قوم کے چند مخصوص فرقے اس جانب تیزی کے ساتھ بڑھے وہ یہ ہیں۔

۱۔ کائستھ ۲۔ کھتری ۳۔ کشمیری پنڈت

کائستھوں کا خاص پیشہ اور ذریعۂ معاش سرکاری دفتروں کی ملازمت تھی۔ اس لئے انھوں نے فارسی پڑھنا شروع کی اور صدیوں تک ان کو اس زبان سے خاص شغف رہا۔ دفتری کاروبار، حساب کتاب اور لکھنے پڑھنے کے لئے یہ قوم ایک خاص وصف رکھتی تھی۔ یہ اسی وصف کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے شاہان مغلیہ کے زمانہ میں دفاتر کو اپنے ہاتھ میں لیا اور فارسی اور اردو میں غیر معمولی مہارت پیدا کر لی۔ اس قوم کا طرز معاشرت بھی مسلمانوں کے طرز معاشرت سے ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ اب بڑی حد تک حالات دگرگوں ہو چلے ہیں اور فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی نے صورت بدل دی ہے۔ ورنہ آج سے تیس چالیس برس پہلے کائستھ خاندانوں میں بچوں کی تعلیم کی ابتدا فارسی اور اردو ہی سے ہوتی تھی اور عمر بھر وہ فارسی اور اردو کے ادبیات سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ کھتری اپنی دولت اور فوجی روایات کی وجہ سے اس زمانہ میں مسلمان خاندانوں سے بہت قریب آ گئے، اگر وہ فوج میں بھرتی ہوئے تو لشکرگاہوں میں ان کو مسلمانوں سے میل جول کے مواقع زیادہ حاصل ہوئے ویسے بھی کھتریوں کو دولت اور وجاہت حاصل تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ لوگ مسلمان خاندانوں سے شیر و شکر ہوں، انہیں اتحاد اور ارتباط

کے مراسم پیدا ہوں۔ چھتری بالعموم زیرک اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان کا ذہن رسا
بہت جلد فارسی اور اردو سے مانوس ہو گیا اور اس انس نے بہت سے بلندتر
ادیب اور شعرا پیدا کئے جن کے کارنامے تذکروں میں درج ہیں۔

سرزمین کشمیر ہندوستان کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ ہے، اس خطہ میں
جس کثرت کے ساتھ باہر کی قومیں آ کر آباد ہوئیں ان کا شمار ناممکن ہے
کشمیر کی آبادی میں ایران اور یونان کا اثر بہت گہرا پڑا ہے۔ مناظر کی
دلکشی اور آب و ہوا کی لطافت نے اس نسلی امتزاج کے بہترین نتائج پیدا
کئے ہیں۔ کشمیری بالطبع وسیع النظر اور ذہانت کا پتلا ہوتا ہے۔ بلا خوف تردید
کہا جا سکتا ہے کہ من حیث القوم ہندوستان کا کوئی فرقہ اس قدر تیز فہم
نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں نئے ماحول سے جلد مانوس ہو جانے کی صلاحیت انہیں
مبالغہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہندوستان کا یہی وہ خطہ
ہے جس پر غیر ملکی تمدن کا اثر سب سے زیادہ پڑا۔ صدیوں سے کشمیر بیرون ہند
کی تندرست، بلند حوصلہ اور مہم پسند قوموں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ وسط ایشیا
کی ذہانت رفتہ رفتہ منتقل ہو کر خطۂ کشمیر میں سرایت کر چکی ہے، اسلامی تمدن
کی پذیرائی جس قدر فراخ حوصلگی کے ساتھ کشمیر میں ہوئی شاید ہی کہیں اور
ہوئی ہو، کشمیری پنڈت بڑی کثیر تعداد میں فارسی اور عربی کے عالم
گذرے ہیں ان کو فارسی اور اردو سے ہمیشہ ایک گہرا لگاؤ رہا۔ اسی سلسلہ
میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو فرماتے ہیں۔

"یہ کسے معلوم نہیں کہ شمالی ہندوستان میں یہ کشمیری پنڈت
ہی تھے جنھوں نے اپنے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہترین چیزیں
یکجا کر لیں۔ یہ کشمیری پنڈتوں کی فارسی دانی کا طفیل تھا کہ انھیں
مغل درباروں میں منصب ملے۔ انھوں نے کایستھوں کی طرح
بڑے بڑے سرکاری منصب حاصل کئے۔ جب فارسی کی جگہ اردو

نے لی، تب بھی کشمیری پنڈت بہت جلد نئی فضا میں نمایاں ہو گئے[1]"

ہندو مسلم اتحاد کے لئے سب سے مضبوط کڑی اردو زبان ہے۔ اور بقول سر سپرو تمدنی بندھن سیاسی اتحاد کی بہ نسبت کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے ملک کو سب سے زیادہ ضرورت ہندو مسلم اتحاد کی ہے۔ جب تک اس اتحاد کا شیرازہ منتشر ہے، ملک کے لئے سیاسی ترقی محض خیال ہے۔ جب تک ہندو مسلم متحد نہیں انگریزی حکومت کے سایہ میں بھی خود مختار حکومت کا ملنا محال نظر آ رہا ہے۔ اس توضیح سے یہ بات صاف ظاہر ہوئی کہ سیاسی ترقی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ یکساں فرض ہے کہ وہ زبان اردو کو زیادہ مستحکم اور استوار بنائیں تاکہ اس تمدنی بندھن کے رشتہ میں منسلک ہو کر ہندو مسلمان ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگیں، اور آپس میں اتحاد خیال اور اتحاد عمل پیدا ہونے لگے۔ کیسے کوتاہ اندیش کس قدر تنگ نظر ہیں وہ اصحاب جو فرقہ وارانہ جذبات سے متأثر ہو کر ذریعۂ اتحاد کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اردو زبان کا دشمن مادرِ وطن کی آزادی کا دشمن ہے۔ اس کا دل حب الوطنی کے جذبہ سے عاری ہے۔ اور وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے پیامِ موت ہے۔

اردو[2] اور ہندی[3] کا جھگڑا (خصوصاً صوبۂ متحدہ میں) اس صدی کے ابتدائی سالوں

---

[1] "ہماری زبان" صفحہ ۔ یکم ستمبر ۱۹۴۰ء

[2] حالانکہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ ۱۸۰۱ء ہی سے یہ سوال پیدا ہو چکا تھا۔ سر جان گلکرائسٹ نے اس قضیہ کو اس طرح اٹھایا کہ کچھ مصنفین اردو کو بلا کر یہ ہدایت کی کہ اردو کی تمام تر تصانیف عام فہم زبان میں لکھی جائیں اور دوسری طرف سنسکرت آمیز زبان لکھنے کے لئے للو لال جی اور بینی نرائن وغیرہ کو بلا کر ملازم رکھا۔

[3] اردو ہندی کی لڑائی بھی پچھلی صدی کے خاتمہ اور نئی صدی کے شروع میں ہوئی۔ نئی صدی کا پہلا سال (۱۹۰۱ء) تھا کہ لکھنؤ کے پرانے گنگا پرشاد ورما لائبریری میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو زبان کی حمایت کا جلسہ ہوا (نقوش سلیمانی)

میں شروع ہوا، اس زمانہ میں ہندو مسلم مفاہمت کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ حکومت کو اس کا سخت خطرہ تھا کہ کہیں یہ سمجھوتہ راسخ نہ ہو جائے۔ اس لئے سنہ ۱۹۰۰ء میں اس صوبہ کے گورنر سر انیٹونی میکڈانل[1] نے یہ سوال اُٹھایا۔ اسوقت تک دفاتر اور کچہریوں کی زبان اُردو تھی۔ دفعتاً ہندی کو فروغ دینے اور اس قضیہ کو سنگین بنانے کے لئے کچہریوں کے فارم وغیرہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں چھاپے جانے لگے۔ پھر اسکولوں میں ہندی نے سکنڈ فارم کی جگہ لی۔ ترک موالات کے دور کے بعد ہندو مسلمانوں میں پھر شدید سیاسی جھگڑے ہونے لگے۔ ان جھگڑوں کو شدھی اور سنگھٹن نے اور زیادہ زہریلا اور مسموم بنا دیا۔ اردو کو پامال اور ہندی کو فروغ دینے کی کوشش پھر عود کر آئی۔ آخر میں جب کانگریسی وزارتیں یو پی اور بہار میں قائم ہوئیں اس وقت سے تو اردو کو پامال کرنے کے لئے وہ وہ سامان کئے گئے جو وہم و گمان میں کبھی نہ آتے تھے[2]

آج سے پندرہ بیس برس پہلے مفکرین نے اردو کا نام بدل کر ہندوستانی[3] رکھ دیا تھا۔ اور اس زبان کو فروغ دینے کے لئے اس صوبہ میں ہندوستانی اکاڈمی قائم ہوئی تھی۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہو کہ پبلک کے لئے کوئی مفید معقول اور پائدار کام نہ کر سکی۔ ہندوستانی زبان سے مراد غالباً وہ زبان

---

[1] سنہ ۱۸۹۶ء میں صوبہ بہار میں اور سنہ ۱۹۰۰ء میں صوبجات متحدہ میں ہندوستانی تخئیل اور قومیت پر ایک کاری ضرب لگائی گئی اور یہ خیال پھیلایا گیا کہ اردو زبان مسلمانوں کی زبان ہو ہندوؤں کا اس زبان میں اب بھی لکھتے پڑھتے رہنا ان کے دلوں سے ہندو قومیت کے احساس کو فنا کر دے گا اس خیال کے پھیلانے میں انگریز مورخوں اور بعض صوبجاتی گورنروں نے بڑی نکتہ رسی سے کام لیا ہو۔

(ہماری زبان مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۴۰ء صفحہ ۱)

[2] اردو ہندی کشتی کا اکھاڑہ یو پی ہو۔ یہاں کی کانگریسی حکومت نے اردو کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا (میاں محمد بشیر "ہماری زبان" صفحہ ۴ مورخہ یکم فروری ۱۹۴۰ء)

[3] اگرچہ یہ نام انگریزوں نے اردو کو پہلے سے دے رکھا تھا۔

ہو جس کا ڈھانچہ تو اردو ہو مگر جس میں ثقیل عربی اور فارسی کے الفاظ نہ بھرے
جائیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بھاری اور بوجھل سنسکرت کے الفاظ سے
بھی اس زبان کو پاک و صاف کیا جائے۔ ہم سب کو معلوم ہو کہ ہندوستانی
اکاڈیمی کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں، بلکہ اس زمانہ میں ہندو مسلمانوں میں
جس قدر منافرت کا جذبہ بڑھتا گیا اسی نسبت سے اردو میں ثقیل عربی اور فارسی
الفاظ کی بھرمار ہونے لگی۔ اور ہندی میں غیر مانوس اور بوجھل سنسکرت کے
الفاظ بھرے جانے لگے۔ بدیں وجہ دونوں زبانیں زیادہ مغلق تو ضرور ہو گئیں
لیکن ہندوستانی کی تشکیل کے امکانات یک لخت کالعدم ہو گئے ہندوستانی زبان کا
خواب ابتک تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، ادھر دو چار سال سے ہندوستانی
اکاڈیمی کی کارروائیاں بھی بہت کم ہو گئی ہیں گو اس کا عملہ موجود ہو اور
دفتری کام کے علاوہ ایک سہ ماہی رسالہ اردو میں اور ایک ہندی میں نکالا
جاتا ہو۔ یہ حقیقت ہو جس سے کوئی واقف کار انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستانی
زبان کی تحریک کبھی قوی نہ ہو سکی۔ اور ملک کے مدبروں نے اس کا خیر مقدم
اسی جوش و خروش کے ساتھ نہ کیا جس کی وہ مستحق تھی

ہندوستانی کونسی زبان ہو؟ اس سوال نے ایک عجیب الجھن پیدا
کر دی ہو۔ ہندوؤں کا یہ خیال ہو ہندوستانی سے مراد ہندی ہو اور مسلمانوں کا
خیال ہو کہ ہندوستانی کوئی نئی زبان نہیں ہو بلکہ آسان اور رواں اردو کو
ہندوستانی کہا جا سکتا ہو۔ مسٹر ڈبلو۔ بی۔ بیلی نے ہندوستانی زبان کی تشریح
ان الفاظ میں کی ہو۔

"عرب کے سوداگروں کی آمد و رفت اور مسلمانوں کی اکثر یورش
اور حکومت قیامی کے باعث الفاظ عربی و فارسی اسی پرانی
بولی میں مستعمل ہو گئے اور ایک زبان بن گئی جیسے کہ بنیاد قدیم پر
تعمیر نو ہو۔ غرض رفتہ رفتہ اس زبان جدید نے ہندوستان

اور رونق پکڑی اور دہلی کے اہل دربار نے چاہا کہ یہی بولی چالے
ان کاموں میں جو زبان سے تعلق رکھتے ہیں وسیلہ ہو"[1]۔
جہاں تک ہمارا خیال ہو یہ بیان صاف اور واضح ہو ان الفاظ میں اس
زبان کی تعریف کی گئی ہو جس کو عرف عام میں اردو کہتے ہیں۔

ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے، ہمارا مقصد صرف یہ ہو کہ ہم اردو
کے ہندو شعرا کے کارنامے بیان کریں اور ناظرین کو یہ بتائیں کہ برادران وطن
نے بھی اردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ در اصل یہ ہماری بدنصیبی ہو کہ
ہمیں ہندو شعرا کو مسلمان شعرا سے جدا کرنا پڑ رہا ہو ورنہ ادب اور شاعری کا
میدان عام طور سے فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک رہنا چاہئے۔ انگریزی لٹریچر کی
تاریخ میں آجکل کسی ادیب نے اس امر کی کوشش نہیں کی کہ فرنچ اور جرمن
نسل کے شعرا کا تذکرہ علیحدہ مرتب کیا جاتا۔ اور یہودی ماہرین ادب کی فہرست
جدا مرتب کی جاتی۔ یہ ہمارا ملک عجیب وغریب ملک ہو جہاں " ہندو جل"
اور " مسلمان جائے" کے نعرے جگر کے پار ہوتے ہیں۔ اور ہندو ٹیم، اور
مسلم ٹیم کھیل کے میدانوں میں نبرد آزما ہوتی ہیں۔ ہماری ذہنیتیں گندی
اور ہمارے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں ورنہ ہندو شعرا کے کارنامے علیحدہ
بیان کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

ایک ضعیف سا خیال یہ بھی پیدا ہو گیا ہو کہ ہندو شعرا کا کلام فصیح اور
شیریں نہیں ہوتا مگر ہمارے خیال میں یہ ایک نہایت افسوسناک غلطی ہو جس کا
ازالہ جس قدر جلد ہو سکے بہتر ہو۔ یہ غلط فہمی در اصل انشا کے اس بیان سے
پیدا ہوئی جو انھوں نے اپنی کتاب میں درج کیا ہو کہ ہندوؤں کا کلام فصاحت
سے معرّا ہوتا ہو۔ ہمارے خیال میں انشا کا تجربہ نہایت محدود تھا، ورنہ اس
قسم کی غلط بیانی سے پرہیز کرتے۔ اس بیان میں جو راز مضمر ہو وہ صرف یہ ہو کہ

[1] پنجاب میں اردو۔

اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے فارسی سے کماحقہٗ واقفیت ضروری ہو۔ اِس زمانہ میں ہندو نوجوانوں کو فارسی بالاستیعاب پڑھنے کا موقع مشکل سے ملتا ہو، اس لئے ان کو اپنی اردو زبان پر قدرت مشکل سے حاصل ہوتی ہو۔ پچھلے زمانہ میں فارسی کا بہت چرچا تھا اور ہندو اور مسلمان یکساں شفقت کے ساتھ فارسی پڑھتے تھے اسی وجہ سے اس زمانہ کے ہندو شعرا کے کلام میں پختگی اور صفائی موجود ہو۔ اردو پر قدرت کسی زمانہ پر منحصر نہیں ہو بلکہ صرف فارسی کی استعداد پر۔ اس زمانہ میں بھی جو جو ہندو شعرا فارسی سے واقف ہیں وہ زبان اور ترکیب کی عمومی غلطیاں نہیں کرتے۔ مثنوی گلزار نسیم کوئی بہت پرانی نظم نہیں ہو، لیکن اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اس مثنوی کی خوبصورت اور دلکش عبارت پر ہزاروں ادبی کتابیں نثار کی جاسکتی ہیں۔ سرور جہان آبادی کا زمانہ اور زیادہ قریب کا زمانہ ہو۔ سرور فارسی میں بہت کافی دستگاہ رکھتے تھے ان کے کلام کو دیکھئے ہر نظم فصاحت کا ایک پُر ترنم آبشار معلوم ہوتی ہو۔ سرور کی گلکاری نے ہر نظم کو دیبائے مشجر کا ایک ٹکڑا بنا دیا ہو۔ جس کا حسن جمیل بڑے سے بڑے نقاد سے خراج تحسین حاصل کئے بغیر نہ رہے گا۔

بعض حضرات کے دلوں میں شاید یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ پرانے تذکرہ نویسوں نے ہندو شعرا کے کلام بلاغت نظام کی پوری پوری داد نہیں دی، اور غالبًا اسی وجہ سے ہندو اساتذہ کی تعداد بہت کم ہو۔ یہ تو ضرور ہو کہ ہندو اساتذہ کی تعداد بہت کم ہو لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہو کہ پرانے تذکرہ نویسوں نے ہندو شعرا کے کلام کو تعصب اور جانب داری کے ساتھ پرکھا[1]۔ واقعہ یہ ہو کہ پرانے زمانے میں تعصب اور جانب داری کی وبا بہت کم تھی، لوگوں کے دل

[1] مصحفی کے تذکروں میں بیسیوں ہندو شعرا کا حال درج ہو۔ ان کا ذکر بھی اسی گرم دلی اور خوبی سے کرتے ہیں جیسا دوسروں کا۔ اس سے اس زمانہ کی تہذیب اور آپس کی یک جہتی کا اندازہ ہوتا ہو۔ صفحہ ل تذکرہ ہندی (ڈاکٹر عبدالحق)

ہندو مسلم تفریق سے نا آشنا تھے۔ مسلمان استاد ہندو اور مسلمان شاگردوں پر یکساں شفقت کرتے تھے۔ فرقہ ملت اور مذہب کی کوئی تفریق نہ تھی۔ غالب کے لئے ہرگوپال اتنے ہی عزیز ہیں، جس قدر کہ عارف، آتش جس قدر آنند کو عزیز رکھتے ہیں اسی قدر وہ تسنیم سے مانوس ہیں۔ ان لوگوں کا زاویۂ نگاہ ہمارے زاویۂ نگاہ سے سراسر مختلف تھا۔ وہ قابلیت اور ذہن رسا کو پرکھتے تھے، مذہب و ملت کی بندشوں کو فراموش کر کے وہ آپس میں سب بھائی بھائی تھے۔ اگر اس زمانہ میں ملک کی فضا اس قدر امید افزا ہوتی تو ہمیں یقین ہے کہ اردو کی نشو و نما کا ڈھول کچھ اور ہی پڑتا۔

حقیقت میں اردو زبان کوئی نئی زبان نہیں ہے جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں وہ در اصل دہلی اور نواح دہلی کی پرانی بولی ہے۔ رفتہ رفتہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس زبان میں نئے نئے الفاظ داخل ہوئے اور پرانے الفاظ غلط ہو کر اپنی صورت بدلتے گئے۔ اس سلسلہ میں نقوش سلیمانی کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ when also

"ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے۔ اسم، فعل، اور حرف؛ اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں فعل جتنے ہیں وہ دلی ہندی کے ہیں۔ حرف جتنے ہیں ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں۔ البتہ اسم میں آدھے اس ہندی کے اور آدھے عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ ہیں۔ اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ الفاظ مل گئے ہیں جن کے مسمی ان باہر کے ملکوں سے آئے ہیں۔"

اس کے بعد فاضل مصنف نے بہت سے ہندی الفاظ کی فہرست دی ہے، جن کا تقل رفتہ رفتہ دور دور ہوا اور وہ اردو میں شامل کر لئے گئے۔ انکے

---

[۱] مؤلفہ امیر حسن دہلوی مرتبہ جناب مولانا مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

علاوہ کہیں یہ ہوا ہو کہ فارسی اور ہندی دونوں کے ہم معنی الفاظ کو ایک جگہ
کر کے بولنا شروع کیا تاکہ دونوں زبانوں کے الگ الگ جاننے والے ایک
لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی سمجھ لیں۔ جیسے دھن دولت، رنگ روپ، خاک
دھول، کاغذ پتر، رشتہ ناتا وغیرہ۔ اسی سلسلہ میں ہم مولانا مولوی محمد حبیب الرحمٰن
خاں صاحب شروانی کا یہ بیان درج کرتے ہیں جو "سرمایۂ مشترک" کے نام سے
مقدمۂ تذکرۂ شعرائے اردو میں موجود ہے

یہ زمانہ صنعت و حرفت کی ترقی کا ہے۔ گوناگوں مصنوعات سے نہ صرف
بازار بلکہ گھر کے در و دیوار معمور ہیں۔ اسی سلسلہ میں بہت سے مصنوعی مسائل کا
انبار ہے جو ہماری زندگی پر مؤثر ہیں۔ انھیں مسائل میں سے ایک مسئلہ
ملکی زبان کا ہے۔ ایک زبان صرف مسلمانوں کی ہے جس کا نام اردو ہے، دوسری
ہندوؤں کی ہے، اس کو ہندی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے چاروں گوشوں کو
دیکھا، شہر، دیہات، پہاڑ اور جنگل دیکھے مگر زبان کی یہ تقسیم کہیں عمل پذیر
نہ دیکھی، تذکرۂ میر تقی اور تذکرۂ میر حسن کے مطالعہ سے صاف واضح ہے کہ
ریختہ کہو، اردو کہو، ہندی کہو، جو نام چاہو رکھو، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان
کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہل ادب کی محنت مشترک کا ثمرہ ہے۔ ابتدائے
شاعری سے لیکر انتہا تک یہ اشتراک محنت عیاں ہے۔ نکات الشعراء میں جہاں
متقدمین شعراء میں خان آرزو اور قزلباش امید ہیں وہاں رائے آنند رام
مخلص اور ٹیک چند بہار بھی ہیں۔ متوسطین میں بندرابن راقم ہیں۔ میر حسن
کے تذکرہ میں بھی بہت سے ہندو شعراء کا ذکر ہے، جن میں سے بعض یکتا استاد
تھے، مثلاً رائے سرب سنگھ دیوانہ ان کی نسبت لکھا ہے۔

"شاعر زبردست و در فارسی شعر میا گفتہ است استاد ریختہ
گویان لکھنؤ چنانچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیران و اکثر دیگران
شاگرد او اند و در آنجا مشہور و معروف است"

حسرت مذکور اساتذۂ لکھنؤ میں سے ہیں۔ جرأت کے استادشاگردوں کی یہ کثرت تھی کہ پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایک اور معتبر شہادت ملاحظہ ہو۔ منشی کریم الدین نے تذکرۂ شعرائے ہند میں (جو ڈمی ٹاسی کے ماخوذ ہے) طبقۂ دوم کے ان شعرا کے ذکر میں لکھا ہے جو مصلح اردو اور مروج اس زبان کے تھے۔ اور انھوں نے الفاظ کریہہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کر دیا۔ اس طبقہ میں سب سے اول راجہ جسونت سنگھ المتخلص بہ پروانہ کا ذکر ہے یہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے نائب راجہ بینی بہادر کے بیٹے اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے جرأت کی تاریخ وفات کیا خوب کہی ہے۔ ع

"کہو جنت نصیب جرأت ہے

۱۲ ھ ۲۴

پروانہ کے دیوان کی بابت یہ رائے ظاہر کی ہے" دیوان اس شاعر کا دیکھنے میں آیا، بہت اچھا، پاکیزہ اشعار اس کے ہیں"۔ اسیر نگر بہادر کے پاس وہ دیوان موجود تھا، میر حسن نے اپنے تذکرہ میں حسب ذیل شعرا کا ذکر لکھا ہے۔

" رائے پریم ناتھ، ٹیک چند بہار، سنتوکھ رائے بیتوا، سیا ناتھ سنگھ لالہ سرب سنگھ دیوانہ، گھاسی رام خوشدل، بندرابن راقم، لالہ ہلاک رائے رنگین لالہ خوش وقت رائے شاداب، رائے بھگار ہی داس عزیز، فارغ، بدھ سنگھ قلندر، لالہ کاشی ناتھ، انند رام مخلص، راجہ رام نرائن موزوں، عجائب رام نششی، لالہ نول رائے وفا ر۔"

ان حالات کے ہوتے ہوئے مذکورۂ بالا مصنوعی تفریق کو دیکھ کر چارۂ کار یہی ہے کہ ملک اور اہلِ ملک کے حال پر افسوس کیا جائے۔

اردو شاعری کو پانچ دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے اختصار اور سہولت کے پیش نظر اسے تین دور پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) پہلا دور، جس میں ولی، آبرو، ناجی، میر، درد، وغیرہ ہیں۔

(۲) دوسرا دور، جس کے نامور شعراء ذوق، غالب، مومن، آتش، وغیرہ ہیں۔

(۳) تیسرا دور، جو حالی سے شروع ہوتا ہے اور اس وقت تک جاری ہے۔ اس دور کے نامور شعراء چکبست، سرور، حسرت، جگر، اصغر، فانی، جوش، روش، ساغر، احسان، اور مجاز ہیں۔ اور جناب اقبال ـــ ؟ !! دراہ در

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ادوار کی خصوصیات علیحدہ علیحدہ بیان کر دی جائیں تاکہ ناظرین کو ہندو شعراء کے کلام کی دلکشی سمجھنے میں آسانی ہو ان ہندو شعراء کو بھی جن کا اس تذکرے میں بیان ہے تین ادوار میں علیحدہ علیحدہ جگہ دی گئی ہے تاکہ ہندو شعراء کا کلام سمجھنے کے لئے مناسب پس منظر مرتب ہو جائے۔ اس کتاب میں کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے صرف آخری دور پیش کیا گیا ہے۔

اردو شاعری کا پہلا دور خصوصیت کے ساتھ نہایت درخشاں، اور کامیاب ہے، اس زمانہ کے شعراء کی زبان سہل، عام فہم، لطیف اور پاکیزہ ہے، اس وقت تک اردو میں ہندی کے شیریں اور خوش آہنگ الفاظ موجود تھے۔ جو اس دور کے اشعار میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور جن کو سُن کر قوتِ سامعہ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ شروع شروع میں اردو زبان سوائے ہندی دوہوں اور بھاشا کے مضامین کے لئے سب سے زیادہ مناسب تھی۔ اس دور کے شعراء نے اس میں فارسی ترکیبیں اور فارسی مضامین کو بھی داخل کیا، مگر ہندی دوہوں کی وجہ سے اردو میں ایہام اور الفاظ ذو معنی کثرت سے داخل ہو گئے۔ اس کے باوجود اس زمانہ کی شاعری میں تکلف اور تصنع بالکل نہیں ہے، شاعر جو کچھ آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے اور جو کچھ حالات اس کے

دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ بے تکلف اشعار کا موضوع بن جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اشعار کی یہ سادگی اور بے تکلفی حد درجہ پُرلطف ہے، دوشیزۂ سخن مشاطہ کے بناؤ سنگار سے عاری ہے اور یہ حسن سادہ انتہائی دلکشی اور دلفریبی کا حامل ہے۔

اس دور میں عشق و محبت کے جذبات کے ساتھ ساتھ شعراء کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت گہرا ہے، اس زمانہ کی سوسائٹی میں فقرا اور کاملین کا ایک خاص درجہ تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ خیالات کی دنیا پر فارسی اثرات ہتبارت کے ساتھ موجود تھے اور چونکہ فارسی شاعری میں تصوف کا عنصر غالب ہے اس لئے اردو شاعری بھی اسی روش پر چل نکلی، اس اثر کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ کلام میں متانت پختگی اور سنجیدگی پیدا ہو گئی اور اس زمانے کے کسی شاعر نے حیا سوز شوخی اور بیباکی کر ہجو کی صنف کے علاوہ اور کسی صنف شاعری میں جگہ نہ دی۔ ان شعراء کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں جو اس وقت تک ایک بولی کی حیثیت رکھتی تھی ایک ادبی شان پیدا کر دی، جس زمانہ کے ہر سنجیدہ تحریر کی زبان فارسی ہو، اس زمانے میں اردو کے خزانے میں ایسے گہر ہائے آبدار جمع کر دینا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کی ابتدائی شاعری میں بھی صرف حسن و عشق اور تصوف کی داستانیں ہیں مگر بقول آزاد۔

"اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ کوئی مکمل فائدہ اس سے نہ ہوا، اور اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستہ سے نہیں آیا بلکہ فقیرانہ شوق یا تفریح کی ہوا سے اُڑ کر آ گیا تھا کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا کہ محمد شاہی عیاشی اور عیش پرستی کا خون بہاتا اور راہل ملک کو پھر تیموری اور

بابری میدانوں میں لا ڈالتا یا تہذیب و شائستگی سے اکبری عہد کو
پھر زندہ کر دیتا۔"

آزاد مرحوم کو اردو شاعری سے غالباً یہ شکایت ہو کہ اس کی ابتدا رزمیہ نظم سے کیوں نہ ہوئی اور اس دور کے شاعروں میں ولولہ انگیز جذبات کا انعکاس کیوں موجود نہیں ہو یہ اعتراض اکثر وہی حضرات کرتے ہیں جو یہ بات بھول جاتے ہیں کہ شاعری اپنے دور کے احساسات اور جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہو۔ اردو کی ادبی شاعری کی ابتدا اس وقت ہوتی ہو کہ جب دہلی کی شان و شوکت میں گھُن لگ جاتا ہو اور ملک میں یاس و نا اُمیدی کی کیفیت پھیل جاتی ہو اور یہ شاعری پروان اس وقت چڑھتی ہو جب لکھنؤ کا رہا سہا سُہاگ لٹ جاتا ہو۔ ایسی صورت میں اردو شاعری کے پہلے دونوں ادوار میں یاس، نا اُمیدی، حزن، قنوطیت کے جذبات کثرت سے پائے جاتے ہیں تو کچھ تعجب کا مقام نہیں ہو

ذیل میں اس دور کی شاعری کے اکثر اصناف کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس سے اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ اس دور میں آمد، سادگی تصوف اور ہندی الفاظ کی دلکش ملاوٹ پائی جاتی ہو۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا — جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

مسند گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہو وظیفہ مجھ دل بیمار کا

(ولی)

آیا ہو صبح نیند سے کچھ رسمسا ہوا — جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

(آبرو)

اے صبا کہہ بہار کی باتیں — اس بہت گلعذار کی باتیں

(ناجی)

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
کیا ہو جو قفس تک مرے اب صحنِ چمن سے — وہ برگ لئے گل کی نسیمِ سحر آوے

(سودا)

آوے بھی مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو — بیمار ہے ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو

(مجذوب)

دیکھنے کو رہے نہ سننے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
کون سا دل ہے جس میں خانہ خراب — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
اس نے مقصد کبھی میرے نالے کو — نہ سنا ہے، اگر سنا ہوگا
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر — مگر یہ زندگیِ مستعار رکھتے ہیں

(درد)

بادِ صبا تو عقدہ کشا اس کی ہو جیو — مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں

(فغاں)

خوبرو خوب کام کرتے ہیں — اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

(ولی)

اردو شاعری کے دوسرے دور کا تاریخی پس منظر ذہن میں رکھنے کے قابل ہے۔ دولتِ مغلیہ کا آخری چراغ دہلی کے قلعۂ معلّٰی میں ٹمٹما رہا ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار دم توڑ رہا ہے، انگریز رفتہ رفتہ ملک کے مالک بن رہے ہیں۔ نواب اودھ کی سرمستیاں زوروں پر ہیں، مگر دوربیں افراد سمجھ رہے ہیں کہ عیش و نشاط کی یہ بساط بہت جلد اُٹھنے والی ہے۔ نکبت اور فلاکت کی گھٹائیں ملک پر چھائی ہوئی ہیں، مگر عیش کے متوالے اور عشرت کے فدائی ایک مدہوشی کے عالم میں محوِ خواب ہیں۔ ناگاہ غدر کا شور اُٹھتا ہے اور شمالی ہند میں ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ ہزاروں مرفہ الحال خاندان نانِ شبینہ کو محتاج ہو جاتے

ہیں۔ خاندان مغلیہ کا آخری چراغ بادِ صرصر کے جھونکوں سے گل ہوا، اور نواب اودھ ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے مٹیا برج میں اقامت گزیں ہو آن کی آن میں دنیا پلٹ جاتی ہو، مگر اسی زمانے میں آسمان ادب اردو کے تابندہ ستارے دہلی اور لکھنؤ کے افق پر ضیا پاشی شروع کر دیتے ہیں اور ملک میں جس قدر سیاسی تباہی پھیلتی ہو اردو شاعری اسی قدر ترقی پذیر ہوتی ہو غالب اور مومن کو اگر اس دور سے الگ کر دیا جائے، کیونکہ ان کی خصوصیات جدا جدا ہیں (نہ زمانہ ان پر اثر ڈال سکا اور نہ یہ زمانے کی روش سے متأثر ہوئے) تو آپ کو اس دور کی شاعری میں تاشے باجوں کی صدائیں، اور ارغوانی رنگ پاشی نظر آئے گی، اس دور کی سوسائٹی حد درجہ کمزور، بزدل اور عشرت پرست ہوگئی تھی، اس کا اگر صحیح چربہ دیکھنا ہو تو اس دور کے شعراء کا کلام ملاحظہ فرمائیے، اردو شاعر اپنی پرانی متانت اور سادگی فراموش کر چکا ہو، وہ سرمستی اور مدہوشی میں مبتلا ہو، عشق بیباک کی حیاسوز داستانیں بڑے ذوق وشوق سے بیان کرتا ہو، شاہد بازاری کی عشوہ طرازیاں، رقیب روسیاہ کی فریب کاریاں حسن پرکار کی قیامت خیزیاں، اور محبت کی ہوسناکیاں اس کی شاعری کا سرمایہ ہیں، وہ اس سرمایہ کو زندگی کا ماحصل تصور کرتا ہو لیکن فلسفہ کی گہرائی حقائق کی بوقلمونی اور زمانہ کی نیرنگی سے بے خبر ہو، وہ محاوروں کے چٹخاروں اور زبان کی خارجی لطافتوں پر سر دھنتا ہو لیکن زندگی کی وزنی حقیقت اور اس حقیقت کے پیچیدہ مسائل سے اُس کی روح کوسوں دُور بھاگتی ہو۔ اس دور کا سب سے بڑا کمال ایک خارجی کمال ہو، یعنی زبان کی اصلاح، محاوروں کی درستی، اور الفاظ کی تراش، بقول آزاد

"مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اُٹھائیں گے، انھیں کو ٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔"

(آب حیات)

یہ ضرور ہو کہ اس دور سے زبان اردو کو غیر معمولی فائدہ پہونچا لیکن شاعری کی عمارت میں کوئی بلندی پیدا نہ ہوسکی۔ اس نشر پر تعجب ہوتا ہو جبکہ سیاسی اقتدار کی بربادی کی تلخی بھی دور نہ کر سکی۔

انکھڑیاں سرخ ہو گئیں جیسے | دیکھ بیٹھے کمال بوسہ کا
(انشا)

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں | ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا | چمپئی رنگ اسکا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
شب وصل یہ تلاش تھا یہ وہ سو گیا تو منہ سے | نہ ذرا میں بھی دو پٹہ ذرہ حجاب اُٹھا
دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا | جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا
مل گئے سینہ سے سینہ پھر گیا اضطراب | مر مٹے پر کبھی گیا اپنے نہ دل کا اضطراب
(انشا)

اس کے دربر میں گیا سوانگ بنا لے تو کہا | چل بے چل دور ہو کیا لیکے فقیری آیا
کہ مری عوض ہوا ہو اسے اضطراب اُلٹا

اسی قسم کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر عبداللطیف لکھتے ہیں۔
"ان کی شاعری صرف داخلی پہلو رکھتی تھی اور اسکی بھی یہ حالت تھی کہ تخلیقی ادب سے کوسوں دور تھی، سچ تو یہ ہو کہ ان کے زمانے میں شاعری صرف مرصع کاری بن کر رہ گئی تھی، فارسی تخیل کو اردو لباس عطا کرنا بس یہی اُن کا کارنامہ تھا۔"
اور صاحب گل رعنا لکھتے ہیں۔
"خیالات کے اعتبار سے اس دور کے شعراء کا کلام پڑھو تو ان میں کسی طرح کی تازگی نہ پاؤگے، وہی گل و بلبل کی داستان،"

شمع و پروانہ کا قصہ، لیلیٰ مجنوں کی کہانی، جفائے ناز، رشکِ اغیار
شوقِ وصال، رنجِ فرقت، زلفِ پریشاں، چشمِ فتاں، نرگسِ بیمار
سیبِ زنخداں، رندی و بادہ خواری، زاہدوں پر طعن و تعریض
کے مضامین کو الفاظ کے اُلٹ پھیر اور ردیف و قافیہ کے
اَدل بدل سے باندھ کر مختلف شکلیں پیدا کر لی ہیں۔"

لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازے پر
شعلہ سا ایک جیبِ کفن سے نکل گیا

بوسۂ خالِ زنخداں سے شفا ہو گی ہمیں
کیا کریں گے اے طبیب اس تیرے بہلانے کو ہم

لپٹ کے یار سے سوتا ہوں مانگتا ہوں دعا
تمام عمر بسر یا رب ایک کروٹ ہو

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

لڑتے ہیں پریوں سے کشتی پہلوانِ عشق ہیں
ہم کو ناسخ راجہ اندر کا اکھاڑا چاہیے ×

(ناسخ)

ہے یہ تمنا میرے جی میں یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں
ہاتھ میں ساغر، بر میں مینا، سر پہ طرہ، ہار گلے میں

(نصیر)

تھا تو جہاں میں مثلِ پری اس لب کے سامنے
سب ہو لیا تیرا لعلِ بدخشاں کے سامنے

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

ساتھ ان کے ہیں ہم سایہ کے مانند و لیکن
اس پر بھی جدا ہیں کہ لپٹنا نہیں آتا

(ذوق)

کیا یہ ذوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ
وگرنہ ربط کی اُس سے ہزار راہیں تھیں

ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزہ جاتا رہا

(آتش)

اے فلک موردِ عتاب ہوں میں — وصل سے خاک کامیاب ہوں میں
تم میں یہ وصف ہو کہ ہو بے داغ — مجھ میں یہ عیب بے حجاب ہوں میں
آئی شوخی میں کہاں سے تمکیں — پڑ گیا صبر تمنائی کا
کیوں بہانے کئے شبِ وعدہ — صاف کہہ دو کسی سے ملنا تھا

اردو شاعری کا موجودہ دور آزاد اور حالی سے شروع ہوتا ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ یہ دور کامیاب اور نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اس دور میں وسعت تنوع اور نئے نئے تجربات پائے جاتے ہیں۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اگر اردو شاعری اس وسعت اور تنوع کی طرف مائل نہ ہوتی یا اگر اس میں اس وسعت کو قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اردو شاعری فنا ہو چکی ہوتی۔ اس زبان کی پائداری اور آیندہ کی ترقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کا ادب ہر نوع کی وسعت کو قبول کر سکتا ہے، اردو کا شاعر غزل کی تنگ اور فرسودہ وادی میں مقید تھا وہ اس قید و بند سے باہر نکل آتا ہے اور اپنے سامنے نئی نئی راہیں دیکھتا ہے اور ان پر گامزن ہوتا ہے۔ مضامین عشق و محبت جن پر اردو شاعری کا دارومدار تھا پس پشت ڈال دیے جاتے ہیں اور نت نئے ولولہ انگیز موضوعات اردو شاعری پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں ملک کی آزادی انقلاب کی تڑپ، مزدور کی تباہ حالی سرمایہ دار کی انانیت کے ساتھ ساتھ مناظر کی مصوری، جذبات عالیہ کی تحلیل حقائق کا حال اور اخلاق کے درسیات پیش کئے گئے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ مناظر قدرت کا بیان دوسرے دور کے شعرا کے کلام میں بھی موجود تھا، لیکن اس زمانے میں یہ مناظر ضمنی طور پر بیان کئے جاتے تھے، ان کو کوئی مستقل حیثیت حاصل نہ تھی۔ دورِ جدید میں مناظر قدرت

خاص طور پر بہت شاعری بنائے گئے ہیں اور اس امر کی کوشش کی گئی ہو کہ معیاری مناظر کے بجائے اصلی اور ٹھیٹھ ہندوستانی مناظر پیش کیۓ جائیں۔ اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہو کہ اس دور کے شعراء واقعہ نگاری پر خاص زور دیتے ہیں، انھوں نے متاخرین کی بدعت غلو کو فراموش کر دیا ہو اور حقیقت نگاری کو اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔ اس دور میں استعاروں اور تشبیہوں سے گریز کیا جاتا ہو، جو کچھ بیان کیا جاتا ہو آسان پیرایہ اور نیچرل طریقہ سے بیان کیا جاتا ہو۔

اس دور کی شاعری میں دو اور چیزیں پیدا ہو گئی ہیں۔ قومی شاعری اور وطنی شاعری قومی شاعری کی ابتدا حالی نے "مدوجزر اسلام" لکھ کر کی اور وطنی شاعری جنگ آزادی کا ثمرہ ہو جس میں ہندوستان کا ہر وطن پرست مصروف عمل ہو۔ قومی شاعری کو اقبال نے بلندی کے آسمان تک پہونچایا اور وطنیت کے سلسلہ کی عمدہ نظمیں چکبست، سرور، اور صفی نے لکھیں۔ قومی شاعری نے مسلمانوں کو خواب گراں سے بیدار کیا، اور وطنی شاعری نے ملک کی آزادی کی آگ ہندوستانیوں کے دلوں میں روشن کی، رفتہ رفتہ سیاسی مسائل شاعری میں آنے لگے، یہاں تک کہ اب کوئی ملکی قومی یا بین الاقوامی مبحث ایسا نہیں ہو جو شاعری کا موضوع نہ بن چکا ہو، اسی سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس دور کے غزل گو مثلاً حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی نے نہایت بلند پایہ غزلیں لکھیں، جن میں عشق و محبت کی مہذب اور سچی واردا تیں، تصوف کی چاشنی، فلسفہ کی جھلک، اور سوز و گداز کی کیفیتیں بڑی فراوانی کے ساتھ موجود ہیں۔

ان خصوصیات کے علاوہ چند اور خاص باتیں ہیں جو افسوس ہو کہ اردو شاعری میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ مثلاً عریانیت، شابیات، عریانی، فحاشی، الحاد، خدا سے توہین آمیز دلگی، ایسے کلام کو پڑھ کر

خوف ہونے لگتا ہے کہ ہمارے نوجوان شاعر جوانی کے زعم میں حدودِ متانت سے متجاوز ہوئے جاتے ہیں اور خدا جانے کہ جوانی کی یہ اُمنگیں کہاں جا کر رُکیں۔ بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ مغربی تہذیب کے زیر اثر یہ ردِ عمل ہے اس مذہبی رنگ کو جو صدیوں سے ہندوستان کی فضا پر مستولی تھا یہ اس باغیانہ جذبہ کا ایک پہلو ہے جو مغربی تہذیب کے آنے کے بعد ہندوستان میں عام طور سے پیدا ہوا۔ پُرانی تہذیب کے خلاف بغاوت

ہمارے خیال میں بغاوت کا یہ جذبہ صرف اسی حد تک قابل تحسین ہے جب تک وہ مناسب حدود سے آگے نہ بڑھے ورنہ بغاوت کے جذبات سے مشتعل ہو کر اگر ہمارے شعرا نے کلچر کی عمارت کو سراسر مسمار کر دیا تو ملک کے لئے اس سے زیادہ مہلک تباہی اور کوئی نہ ہو گی۔ اردو شاعری کے سلسلہ میں جو بغاوت عمل میں آئی ہمارا خیال ہے کہ اس کے نتائج اچھے مرتب ہوئے۔ عام طور پر اس کا اردو شاعری پر خوشگوار اثر پڑا، اور ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تیسرے دور کے جواہر ریزے بغیر کسی پس و پیش اور جھجک کے دنیا کی علمی زبانوں کے ادبی شہ پاروں کے سامنے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اردو شاعری کو یہ سربلندی یہ سرافرازی اور یہ رعنائی تیسرے دور ہی میں حاصل ہوئی۔

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے جو اظہارِ تمنا کر دیا

وہ دُور ہی سے ہمیں دیکھ لیں یہی ہے بہت
مگر قبول ہمارا سلام ہو جائے

مجھ سے تم چھپنے لگے اچھا کیا، یونہی سہی
اور جو میں اب دیدۂ دل سے تمہیں دیکھا کروں

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

عشق سے حاصل ہوئی کیا کیا پشیمانی مجھے — عشق جب دینے لگا تعلیمِ نادانی مجھے

غلط ہو آپ نہ تھے ہم کلام خلوت میں — عدو سے آپ کی تصویر بولتی ہوگی

کوئی منھ چوم لیگا اس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

جنابِ شیخ نے جب پی تو مسکرا کے کہا — مزہ بھی تلخ ہو، کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

عطائے لذتِ سوز و گداز کی خاطر — اذیتوں کے خزانے لٹا دیے تو نے
سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر — بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا دیے تو نے
بنا کے ہجر کی لذت کو بے نیازِ سحر — تعینات کے پردے اٹھا دیے تو نے

آئی جب اُن کی یاد تو آتی چلی گئی — ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
ہر واقعہ قریب تر آتا چلا گیا — ہر شے حسین تر نظر آتی چلی گئی
ویرانۂ حیات کے ایک ایک گوشہ میں — جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
جتنا کہ کچھ سکون سا آتا چلا گیا — اتنا ہی بے قرار بناتی چلی گئی
بے حرف و بے حکایت و بے ساز و بے صدا — رگ رگ میں نغمہ بن کے سماتی چلی گئی
میں تشنہ کامِ شوق تھا پیتا چلا گیا — وہ مست انکھڑیوں سے پلاتی چلی گئی
اک حسنِ بے جہت کی فضائے بسیط میں — اڑتی گئی مجھے بھی اڑاتی چلی گئی

دل راز ثبات تجھ کو معلوم نہیں
اصلی حالات تجھ کو معلوم نہیں
تو نقطۂ اصل و مرکزِ ہستی ہے
شاید یہ بات تجھ کو معلوم نہیں

گھنے درخت، ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں ہیں
ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں

رخصت طلب ہے مجھ سے اب آہ عمرِ فانی
ہاں ہے کوئی دم کی زنداں میں زندگانی
میں غم نصیب اپنی کس سے کہوں کہانی
اک تیری آرزو ہے، اک حسرتِ جوانی
لیکن محال ہیں یہ دونوں خیال میرے
ارماں بھی مٹیں گے بعد وصال میرے

خاک افسردہ میں شعلے سے دہک اٹھے ہیں
بجلیاں دوڑ گئیں برف زدہ نہروں میں
مضطرب آتشِ سیال سی ہے لہروں میں
اک نیا جوش ہے دیہات میں اور شہروں میں
بام و در نورِ مسرت سے چمک اٹھے ہیں

برسات کی ایک شام

خنک ہواؤں میں اٹھتی جوانیوں کا خرام
کنارِ دشت میں برسات کی گلابی شام
فلک پہ بازیِ طفلانہ ابر پاروں کی
ندی کے موڑ میں انگڑائیاں نواروں کی
فضا شگفتہ، گھٹا لال گوں شفق جو نچال
ہوا لطیف، زمیں نرم، آسماں سیال

اسطرف جورِ خزاں تھا اُسطرف لطفِ بہار
اِسطرف مزدور تھا اور اُسطرف سرمایہ دار

اللہ اللہ اس قدر عدل و تناسب کی کمی
اِسطرف بھی آدمی تھے اُسطرف بھی آدمی

کوئی محروم اور کوئی رحمتوں سے بہرہ مند
آدمی اور آدمی میں اسقدر پست و بلند

آہ اس منزل سے بے ماتم گذر سکتا ہے کون
جز خدا اِس ظلم کو برداشت کر سکتا ہے کون

ساحل پہ نئی آن ہے ہر ماہ لقا کی
ہر گام پہ کھُلتی ہے گرہ زلفِ رسا کی

اللہ ری کرامت اثرِ لغزشِ پا کی
رہ رہ کے لچکتی ہے کمر ارض و سما کی

حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کے دوش بدوش
زمیں پہ کفر و بغاوت کی شاعری بھی رہے

اے خالقِ اربابِ نظر جز مے معشوق
میں تجھ سے کوئی اور تمنا نہیں رکھتا

حیران ہوں لیکن کہ بایں دعویِ اکرام
یہ بھی ترا اخلاق گوارا نہیں رکھتا

کلیجہ پھُنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے

یہ وہ آندھی ہے جسکی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جسکی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے

پھینکدے اے دوست اب بھی پھینکدے اپنا رباب
اُٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر
مجھکو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اُٹھا سکتا ہوں میں

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں
(احسن)

اردو شاعری کے تیسرے دور ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس دور کی شاعری بجائے فرد سے مخاطب ہونے کے قوم یا سماج سے ہمکلام ہوتی ہے۔ بجائے انفرادی جذبات و احساسات بیان کرنے کے (جو ہمیشہ عشق و محبت پر محدود رہتے تھے) اس دور کی شاعری قومی مسائل، ملکی جذبات اور ملی احساسات پر حاوی رہی، خود اندازہ کیجئے کہ اردو شاعری کی وسعت میں کس قدر عظیم الشان اضافہ ہوا، اور یہ اضافہ اس زبان کی شاعری کے لئے اور خود ملک کے لئے کس درجہ مفید ثابت ہوگا۔

آخر میں مجھے ان حضرات سے کچھ عرض کرنا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اردو زبان ہندو قوم کی عاجزی، مجبوری، محکومیت اور غلامی کی ایک بدیہی یادگار ہے اس لئے اس یادگار کو جلد سے جلد برباد کر دینا چاہئے ورنہ اس یادگار کے ذریعہ ہندو قوم کو اپنی غلامی کا زمانہ ہمیشہ یاد آتا رہے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض ذمہ دار حضرات اس نوع کے خیالات کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں حالانکہ یہ حضرات اس امر کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اردو زبان اس ہندو مسلم اتحاد کی ایک ابدی اور غیر فانی یادگار ہے جس کا خواب اب پریشان ہو چکا اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے مادرِ وطن کا ہر محبت کرنے والا فرزند بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہا اور ہندوستان کے ہر وطن پرست سپوت کی یہ اولین آرزو ہے کہ یہ اتحاد جلد سے جلد قائم ہو کر اس ملک کی قومی زندگی کا طرۂ امتیاز بن جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی چند مخلص اور باہمت ہندو ایسے ہیں جو بار بار حقیقت کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں مگر سیاسی اور فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائیوں میں ان کی مدھم آواز مشکل سے سننے میں آتی ہے۔

دورِ حاضرہ کی خصوصیات جناب آمن لکھنوی نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کی ہیں۔

"بیسویں صدی کے دوسرے ربع کی شاعری نے ایک اور صورت اختیار کی، یعنی ترقی پسند شاعروں کا ایک طبقہ اُٹھا جسکے پیمبر شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی ہیں، اس طبقہ کے نزدیک اصلاح پسندی سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی انقلاب برپا کرنا ہوگا، مذہبی جکڑبندیوں نے اس طبقہ کو بیزار کر دیا ہے۔ غریب طبقہ کی مصیبت اور اس کے ساتھ بے انصافیاں اسے خون کے آنسو رُلاتی ہیں، اس کی شاعری خالص جذباتی شاعری ہے قافیہ کیا معنی وزن تک کی پروا نہیں ہے۔ جب سوسائٹی کے نظام کو ہی درہم برہم کرنا ٹھیرا تو پھر شاعری کی قیود کو ہی کیوں روا رکھا جائے۔ احسان نے صاف صاف کہدیا کہ میں ایطا کو شاعری کا عیب نہیں جانتا اور اس اعلان کے ساتھ لپٹا اور چکپٹا کا قافیہ نظم کر دیا، اس دور کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ابتک کی شاعری تو شہری ماحول کے مطابق ہوتی تھی، اب دیہات نظم کا موضوع بنتا جا رہا ہے، آپ اسے اچھی کہیں یا بُری پہلے تو شاعر صرف شیخ و برہمن واعظ و زاہد پر پھبتیاں کسا کرتے تھے۔ اس دور میں اللہ میاں پر بھی پھبتیاں کہی جانے لگیں، احسان ذرا ادب سے اور جوش بے ادبی کے ساتھ اللہ میاں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مجاز بھی ان کے ساتھ ساتھ ہیں، منظر کشی اور فطرت نگاری اس دور میں زیادہ ہے، جذباتک اکثر الفاظ پر غالب آجاتے ہیں۔ اگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھئے تو یہ شاعری بھی مغرب کے اثر کا ہی نتیجہ ہے۔ مغرب میں پچھلی صدی میں کمیونزم کی بنیاد پڑی، اور

گذشتہ جنگ عظیم میں اس تحریک نے ایک مستقل نظام کی صورت اختیار کر لی، ہر ادب پر مکسیم گورکی اور ٹالسٹائی کی تحریروں کا اثر پڑا، اردو ادب اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا وہ اب درباروں کے پردے میں پرورش نہیں پا رہا تھا بلکہ سر عام جلوہ نمائی کر رہا تھا، اس نے بھی یہ اثر قبول کیا، مزدوروں اور کسانوں کے متعلق نظمیں اب سے پچیس سال پہلے کہاں سننے میں آتی تھیں اب ان نظموں کی بہت کثرت ہے، مذہب کے خلاف جہاد کو بھی اس سے وابستہ سمجھنا چاہیے۔ احسان حیران ہے کہ قرآن کو جان سے زیادہ عزیز رکھنے والا مزدور پریشان حال کیوں ہے، جوش اللہ میاں سے خفا ہیں کہ اس کے نظام میں کروڑوں انسانوں کی بد حالی کیوں ہے سوشلزم اردو شاعری میں سب سے پہلے اقبال مرحوم نے داخل کیا، لیکن یہ اسی قسم کا تھا جیسے یورپ میں عیسائیوں کے ایک طبقہ نے چرچ اور سوشلزم کو ملا کر ایک نیا فرقہ بنا لیا ہے۔ شیطان کی اہمیت اقبال نے بھی مانی، شیطان کا روشن پہلو بھی دکھایا لیکن جوش تو یہاں تک فرماتے ہیں۔

شیطان و ابوجہل کی عظمت کی قسم
سو بار غلامی سے بغاوت بہتر

جوش اللہ میاں کے بارے میں کہتے ہیں۔

وہ خدا جو آدمی سے چاہتا ہو بندگی
تشنگی جس کو بہت ہو خوشنما الفاظ کی

فاتحہ کا نان وحلوا آئے دن کھاتا ہے جو
اُنگلیوں پر روز اپنا نام گنواتا ہے جو

سر نگوں رہتا ہے جو ابنِ فتن کے سامنے
جس کی کچھ چلتی نہیں ہے راہزن کے سامنے

گرگ سیرت ڈاکوؤں کو تاج پہناتا ہے جو
مومنوں کو کافروں سے بھیک منگواتا ہے جو

مجھ کو لو جو مجھ کو چاہو کی صدا دیتا ہے جو
جو نہ چاہے اُس کو دوزخ کی دعا دیتا ہے جو

حکم ہے جس کا کہ یوں اُنگلی ہلانا چاہیے
جب جماہی آئے تو چٹکی بجانا چاہیے

مَر کے چلنا یا کسی دریا میں بہنا چاہیے
چھینک جب آئے معًا الحمد کہنا چاہیے

جو اگر یوں خم نہ ہو گردن تو کرتا ہے بھسم
یوں جبیں کو ٹیک دو تو مائلِ جود و کرم

یوں ہوں ماتھے پہ لکیریں تو دعا ہو مستجاب
منھ کھُلا کر یوں اگر تو بھی کھُلاؤ تو ثواب

اس طرح زلفیں بنانے یوں کترنے میں نجات
اس طرح اُلٹے لٹک کر یاد کرنے میں نجات

دورِ جدید

کے

آنجہانی ہندو شعراء

سرشار

پنڈت رتن ناتھ در نام، سرشار تخلص ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ کے ایک معزز کشمیری برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر ہی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ فارسی کی تعلیم حسب دستور گھر پہ ہوئی، انگریزی زبان وادب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے مگر چند وجوہ کی بنا پر اس تعلیم کو بھی خیرباد کہنا پڑا، اس طرح علوم متداولہ کی تحصیل کر کے آپ لکھیم پور کھیری کے ایک اسکول میں معلم ہو گئے۔ یہیں سے اُنھوں نے اپنی مضمون نگاری شروع کی اور "مراسلۂ کشمیر" "اودھ پنچ" "مرأۃ الہند" اور "ریاض الاخبار" میں مضامین بھیجے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مشہور ہو گئے۔ سرشار انگریزی زبان سے اردو میں بے تکان ترجمہ کیا کرتے تھے۔ "شمس الضحیٰ" کے نام سے ایک انگریزی کی کتاب کا ترجمہ ۱۸۷۸ء میں شائع کیا، اسی زمانہ میں ڈاکٹر گریفتھ ڈائرکٹر محکمۂ سررشتۂ التعلیم نے ان کا تعارف منشی نول کشور صاحب سے کرا دیا۔ منشی جی کو اودھ اخبار کے لئے اُن دنوں ایک ذہین اور بیدار مغز اڈیٹر کی ضرورت تھی۔ انھوں نے بلا تامل پنڈت جی کو ملازم رکھ لیا۔ اسی اودھ اخبار میں، انھوں نے اپنے مشہور زمانہ "فسانۂ آزاد" کو بالاقساط شائع کرنا شروع کیا جو ۱۸۷۹ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ ۱۸۸۰ء میں وہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ ۱۸۹۳ء تک انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ان میں زیادہ مشہور سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، کڑم دھڑم، پی کہاں، اور بچھڑی دلہن وغیرہ ہیں، انھوں نے اسی زمانہ میں ایک اور سلسلہ "مخمکدۂ سرشار" شروع کیا تھا، ۱۸۹۵ء میں آپ حیدرآباد چلے گئے اور ۱۹۰۲ء تک وہیں رہے جتنی کہ

اسی سنہ میں وہیں انتقال بھی ہوگیا۔ حیدرآباد پہنچ کر انھوں نے ایک
ناول "گورِ غریباں" لکھا، مگر وہ شائع نہ ہو سکا۔

سرشار تحریر کی دل آویزی اور زبان کی چاشنی کے لئے بہت مشہور
ہیں۔ مزاج میں حد درجہ کی شوخی تھی، ان کی شہرت ان کی شاعری کی وجہ
نہیں، بلکہ ان کی لافانی کتاب "فسانۂ آزاد" کی وجہ سے ہے، جو دراصل طو
افسانے اور ناول کے درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ رتن ناتھ ایک خوش
شاعر بھی تھے۔ ان کے کلام میں وہ دل آویزی تو نہیں ہے جو ان کی نثر کی
میں پائی جاتی ہے، پھر بھی ان کے اشعار حضرت اسیر لکھنوی کا رنگ لئے ہوئے
۱۸۹۴ء میں انھوں نے ایک قصیدہ "کشمیری کانفرنس" میں پڑھا تھا، جو بہ
مقبول ہوا تھا۔ انھوں نے ایک مثنوی "تحفۂ سرشار" بھی لکھی تھی، جو کشمیری
میں بہت مقبول ہوئی۔ سرشار کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

ہر مرض کی دوا مقرر ہے — مرضِ عشق لا دوا دیکھا

درد و غم و یاس حرماں — اک دل ہے ہزار آفتیں ہیں

گھٹا کالی کالی دھنک لال لال — کنھیا کی ابرو پہ جیسے گلال
گھٹا اور بجلی میں ہے آج چوٹ — ہے آئی دوپٹے میں لچکے کی گوٹ

کس دن شبِ غم جان کو آفت نہیں ہوتی — کب شام سے یاں صبحِ قیامت نہیں
اللہ حسین عشق کے پھندے سے نکالے — دم توڑتے ہیں قطعِ محبت نہیں
الٹی ہی تجھے سوجھتی ہے اے فلکِ دوں — سیدھی کبھی تجھ سے مری قسمت نہیں

گلستانِ عالم پہ چھائی گھٹا — وہ آئی وہ آئی وہ آئی گھٹا

سیہ ابر مغرب سے ایسا اُٹھا — میں سمجھا کہ کعبہ کا پردہ اُٹھا

بنا ساقیا دختِ رز کا نشاں — کہ ہو رنجِ فرقت سے ہونٹوں پہ جاں

کہاں تک یہ گردش یہ دورانِ سر — سفر ہو گیا اب تو مشکل سقر
یہ تفریق اور تفرقہ تا کجا — کہیں رند ہیں اور کہیں میکدہ

حُسن پر اُس پری کے کی جو نگاہ — نظر آئی وہ شکلِ غیرتِ ماہ
حُسن و خوبی میں وہ بتِ مغرور — سر سے پا تک برنگِ شعلۂ نور

مست صہبائے غمزہ و انداز — اُٹھتا جوبن شباب کا آغاز
انکھڑیاں کی لگاوٹ باز — دلربا بات کا نیا انداز

نشہ کے لال لال وہ ڈورے — جس پہ نرگس کے پڑتے ہیں ڈورے
ناک میں بھی وہ نور کا ترکا — چشم زہرہ میں جس کی کھٹکے ضیا
اور گلے میں وہ نور کی ہیکل — دیکھ کر جس کو جالی ہو بیکل
کاندھوں پر وہ دوپٹہ ململ کا — فالسائی رنگا ہوا ہلکا
کرتی شبنم کی آستینوں دار — ملگجے تن پہ اُس کی اور بہار
نشۂ بادۂ شباب سے چور — چال مستانہ حُسن پر مغرور
سینکڑوں دل جل کر کو دیتی ہوئی — جان طاؤس و کبک لیتی ہوئی

سرشار ایک نغز گو پختہ کار اور صاحب ذوق شاعر معلوم ہوتے ہیں،
کلام کا انداز بتا رہا ہے کہ فسانۂ آزاد کا مصنف نثر اور نظم دونوں پہ یکساں
قادر ہو۔ اشعار میں لطافت پاکیزگی اور رنگینی موجود ہو۔

برق

منشی جوالا پرشاد نام۔ برق تخلص ۱۸۶۳ء میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے ۱۸۷۹ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں بی، اے اور ۱۸۸۳ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی ۱۸۸۵ء تک وکالت کی۔ اس کے بعد وہ منصف ہو گئے۔ اس میں اس قدر ترقی کی کہ قائم مقام ڈسٹرکٹ وسشن جج ہوئے ۱۹۰۹ء میں گریفن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے ۱۹۱۱ء میں بعارضۂ طاعون انتقال ہو گیا، وہ ایک قابل شاعر اور زبردست نثار تھے۔ "فسانۂ آزاد" کا طرز تحریر ان کو بہت مرغوب تھا۔ خود بھی وہی انداز اختیار کرنے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ آپ کی مثنوی بہار ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ وہ سرسید مرحوم کو بہت پسند تھی۔ آپ کے کلام میں جذباتی پہلو زیادہ نمایاں ہے، مقامی رنگ بھی آپ کی شاعری کا امتیازی حصہ ہے، فارسی سے زیادہ متأثر نہ تھے، آسان اور عام فہم زبان و عبارت کو بہت پسند کرتے تھے

نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

کیونکر کہوں کہ میٹھا ہے تیوری چڑھائے کون
تم تو خفا نہیں ہو کسے پھر منائے کون

چتون وہ دیکھ لی ہے کہ آپے میں ہم نہیں
دل کو سنبھالے کون جگر کو بچائے کون

خنجر کو لاگ ہم سے ہے اور ہم کو یار سے
کس کو گلے سے دیکھئے آخر لگائے کون

مجھ کو ادب کا پاس ہے ان کو غرورِ حسن
جائے تو جائے کون جو آئے تو آئے کون

وہ تو برس رہے ہیں غضب ہیں گھٹے ہوئے
اے برق تیرے دل کی لگی کو بجھائے کون

دنیا میں ظہورِ صبح ہوا گلشن پہ کیسا جوبن ہے
خورشید کا غنچہ کھلنے لگا اللہ کی قدرت روشن ہے

پیارے پیارے مرغانِ چمن شاخوں پہ بیٹھے گاتے ہیں
چلتی ہے نسیم روح فزا جھونکے اٹھلاتے آتے ہیں

باغوں میں ہزاروں پھول کھلے کیا بھینی بھینی خوشبو ہے
مستی میں شجر ہیں جھوم رہے اک وجد کا عالم ہر سو ہے
ہر پھول میں اس کی خوشبو ہے اکسیر ہے بوٹی بوٹی میں
ہر شاخ میں اس کی خاصیت تاثیر ہے پتّی پتّی میں
پودوں میں جڑوں میں زہر بھرا، زہروں میں نہاں تاثیر شفا
دیکھوں خاصیتِ برگ و شجر تیار کروں کیوں ان سے دوا

برقؔ کی مثنوی بہار سے بھی چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اٹھلاتی، لجاتی، مسکراتی	کس ناز سے ہے بہار آئی
کم سن، الھڑ، حسین، البیلی	چڑھتی کی دلہن نئی نویلی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن	اٹھتی کونپل ابھار کے دن
گہنا پھولوں کا زیبِ تن ہے	دھانی جوڑے پہ کیا پھبن ہے
گھونگھٹ اک ناز سے نکالے	سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے
ہریالی بنی وطن میں آئی	اک سبز پری چمن میں آئی
اتری گلشن میں جب سواری	سورج نے آرتی اتاری
گل نے زرِ گل کیا نچھاور	صدقے ہوئی عندلیب اڑ کر
شبنم بھر لائی کورے کورے	شربت میں گلاب کے سکورے
خورشید نے آئینہ دکھایا	کرنوں نے مورچھل ہلایا
نہریں بھر بھر کے لائیں پانی	سبزے نے بچھایا فرش دھانی
خوشیاں اشجار نے منائیں	میووں کی ڈالیاں لگائیں
غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں	بلبل نے چہک کے دیں دعائیں
مرغانِ چمن نے گیت گائے	کیا کیا نئے زمزمے سنائے
بدلی پھولوں نے اپنی وردی	اودی، زنگاری لاجوردی
بھوروں نے یہ گونج کر صدا دی	کوئل نے یہ پھیر دی منادی
معشوقۂ گلعذار آئی	آئی آئی بہار آئی،

شاد

کشن پرشاد نام، شاد تخلص، سرخطاب ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے، ایک عرصہ تک حیدرآباد کے وزیر اعظم رہے۔ سلسلۂ نسل دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان سے ملتا ہے، ان کے دادا مہاراجہ نرندر پرشاد نواب محبوب علی خاں کے زمانۂ طفولیت میں کونسل آف ریجنسی کے ممبر تھے، آپنے عربی اور فارسی کی تعلیم متعدد قابل اساتذہ سے حاصل کی۔ انگریزی، تلنگی اور مرہٹی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ شاعری میں حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں کے شاگرد تھے۔ وہ آپ کو شاگرد خاص کہکر یاد کرتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ان کو عہدۂ وزارت اور راجۂ راجگان مہاراجہ بہادر کا خاندانی خطاب عنایت ہوا۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۰ء میں کے سی۔ آئی۔ ای۔ اور جی سی۔ آئی۔ ای۔ کے معزز خطابات سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے دست بردار ہوگئے، مگر تھوڑے عرصہ کے بعد پھر یہی عہدہ آپ کے سپرد کیا گیا۔

دو اردو جرائد یعنی "دبدبۂ آصفیہ" اور "محبوب الکلام" آپ نے نکالے۔ پچاس کے قریب آپ کی تصانیف ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔ ترنم خیال، رباعیات شاد، ہدیۂ شاد، فریادِ شاد، مطلعِ خورشید، ایمانِ شاد، خمارِ شاد، نغمۂ شاد، ارمغانِ وزارت، کلامِ شاد، بیاضِ شاد، اور مثنوی آئینۂ وجود وغیرہ وغیرہ آپ کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا۔

آپ کا کلام بہت دلچسپ اور بے تکلف ہوتا ہے۔ زبان میں روانی اور آمد بدرجہ کمال موجود ہے، خیالات فرسودہ اور پامال ہیں۔ فارسی اور عربی اشعار کے بے تکان ترجمے آپنے اردو اشعار میں کئے ہیں اور ترجمہ کی تمام تر خصوصیات کو قائم رکھا ہے۔ آپنے اکثر شعراء کے کلام پر تضمین کی ہے۔ رام بابو سکسینہ صاحب تاریخ

ادب اردو میں رقم طراز ہیں کہ "کلام میں حسن صوری و معنوی دونوں موجود ہیں"۔ جگہ جگہ تصوف کا رنگ غالب ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

کس کو سناؤں جا کے بھلا ماجرائے دل
وہ مجھ کو جانتے ہیں نہ ہو آشنائے دل

فریاد ایک روز قیامت اٹھائے گی
کچھ کم نہیں ہے صور سے میری صدائے دل

گمراہ ہیں ضرور یہ منکر وجود کے
سمجھے نہیں وہ کیا ہے مرا مدعائے دل

ہر ذرہ آئنہ ہے بصد غور اس میں دیکھ
کس آفتاب کی ہے جھلک اے صفائے دل

امید عفو ہے کہ وہ عاصی نواز ہے
ہر چند بے حساب ہیں میری خطائے دل

اس کے سوائے کوئی نہیں ہے جہان میں
ایسی سمجھ ہو جس کو وہ ہے ارتقائے دل

ترتیب کائنات میں پوشیدہ راز ہے
میں کیا بتاؤں تیرا پتہ تجھ کو ہائے دل

اے شاد نا امید نہ ہو اس کے فضل سے
ہے منحصر کرم پہ فنا و بقائے دل

ہے نہ مندر میں نہ مسجد میں نہاں یاد رہے
نور اس کا ہے ہر اک جائے عیاں یاد رہے

سوزش عشق ہے صورت سے عیاں یاد رہے
نہیں بے وجہ مرا دل ہے تپاں یاد رہے

غیر سے عشق کیا ہے نہ کروں گا ہرگز
بدگماں مجھ سے نہ ہو جان جہاں یاد رہے

بندۂ عشق ہوئے دونوں جہاں سے آزاد
اب کہاں دل میں غم سود و زیاں یاد رہے

دل جو ہے شاد کا اے میرے دلارے خواجہ
دیر و کعبہ نہیں ہے تیرا مکاں یاد رہے

خانۂ دل کعبہ ہے یہ کوئی بیگانہ نہیں
بے دھڑک آ جاؤ اس میں کوئی بیگانہ نہیں

نغمۂ توحید ہم سے سن کے واعظ راگ کا
اپنی بیتی ہے یہ کچھ غیروں کا افسانہ نہیں

ذکر سے رندوں کے واعظ تو ابھی واقف نہیں
یہ تو ہو حق کی صدا ہے شور رندانہ نہیں

آپ ہی کے دم قدم سے گھر مرا آباد ہے
خانۂ دل آپ کا ہے کوئی ویرانہ نہیں

عین مستی میں بھی رہتا ہے اسے پاس ادب
ہاں بڑا ہشیار ہے کچھ شاد دیوانہ نہیں

اُس بت کی محبت میں آخر یہی کرنا تھا
اپنے سے گذرنا تھا، سو جان سے مرنا تھا

مطلوب تھا کون اپنا، تھا کون بجز اس کے
کس پہ ہمیں مرنا تھا، اس پر ہی تو مرنا تھا

حالت کہیں کیا اپنی، یوں وصل کی شب گذری
بے چین یہاں ہم تھے، واں اُن کو سنورنا تھا

میخانے میں بُلوا کر اس پیرِ مغاں کو شاؔد
احسان یہ کرنا تھا، ساغر مرا بھرنا تھا

نظر

نوبت رائے نام، نظر تخلص۔ لکھنؤ کے ایک معزز کایستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ ولادت ۱۸۶۶ء بتائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کا خاندان لکھنؤ کے نوابوں کے زمانے سے برسرِ اقتدار تھا۔ نظر نے اوائل عمر ہی میں فارسی اور اردو کی تکمیل کر لی تھی، ازاں بعد انگریزی میں بھی دسترس حاصل کی تھی۔ ان کے زمانے میں لکھنؤ شعر و شاعری کا گہوارہ بنا ہوا تھا، آپ کی طبیعت میں بھی شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ فوراً ہی منظر لکھنوی کے شاگرد ہو گئے اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ ان کے سینہ میں ایک درد مند دل تھا وہ اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دنیا کے کاروبار میں قدم رکھتے ہی ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک رسالہ "خدنگِ نظر" جاری کیا جس میں پہلے صرف غزلیں ہی شائع ہوا کرتی تھیں، لیکن مضامین نثر بھی بعد میں شائع کئے جانے لگے۔ آغا منظر کے یہاں اکثر و بیشتر مشاعرے ہوا کرتے تھے ان مشاعروں کی رُوداد مع غزلوں کے اسی رسالہ میں شائع ہوتی تھی۔ آپ کی خداداد ذہانت اور قابلیت کو دیکھ کر منشی دیا نرائن صاحب نگم ایڈیٹر زمانہ کانپور نے اپنے مقبول عام رسالہ زمانہ کا نائب مدیر بنا کر اپنے پاس کانپور بلا لیا، مگر جلد ہی آپ رسالہ "ادیب" کے ایڈیٹر ہو کر انڈین پریس الہ آباد پہنچے، وہاں بھی دو برس سے زیادہ نہ رہے اور پھر ۱۹۱۲ء میں کانپور واپس آکر "زمانہ" کی خدمت پر متعین ہوئے۔ آزاد کے اجراء میں آپ نے منشی دیا نرائن صاحب نگم کا بہت ہاتھ بٹایا، پھر مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا کی وساطت سے نول کشور پریس میں چلے گئے۔ یہاں پہلے تو "تفریح" کی ایڈیٹری کی، بعدہٗ "اودھ اخبار" کا قلمدان ادارت آپ کے سپرد ہوا۔ نظر کی عمر کا آخری حصہ بہت زیادہ پُر آشوب تھا۔ پے در پے خاندانی صدمات

پہنچے۔ کچھ دنوں اور دھ اخبار سے قطع تعلق ہو گیا، اطمینان قلب رخصت ہوا اور تفکرات و
تردّدات نے قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانہ کے کلام میں بعض اشعار ایسے ہیں
جن سے پتہ چلتا ہے کہ نظر دُنیا سے اُکتا گئے تھے، اور ان کی روح جسد خاکی
چھوڑنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

نظر اب چل کے کرنا چاہئے آباد مرقد کو
بہت ہے منتظر اپنی زمیں گورِ غریباں کی

موت سے کیا ساز کر رکھا ہے اسنے اے نظر　　مدتیں گذریں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

زندگی کی کشمکش سے مرکے پائے کچھ نجات
اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

بار الم نہ اُٹھ سکا کثرتِ اضطرار میں　　مرکے سبب ہوا ہوں میں دیدۂ اعتبار میں

ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

طولِ غم سے مختصر غم کی کہانی ہو گئی　　جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہو گئی
ختم دلچسپی تری اے دارِ فانی ہو گئی　　ہم بھی زندہ تھے کبھی وہ زندگانی ہو گئی
ہر قدم پر ایک نالہ ہر نفس پر ایک آہ　　زندگی کیا ایک شرحِ سخت جانی ہو گئی
مے کو دُنیا آتشِ سیال کہتی ہے نظر　　لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہو گئی

اسی سلسلہ میں جناب نگم صاحب فرماتے ہیں۔

"فطرت سے اُنھوں نے علم و ادب کے لئے نہایت موزوں طبیعت پائی
تھی، قدرت نے اُنھیں نہایت شستہ و سلیم ذوقِ سخن عطا کیا تھا۔ بچپن میں
اُن کو بہت اچھی صحبت ملی تھی، جس سے طبیعت میں رفعت مزاج میں تہذیب
متانت و سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی، اُن کا ذہن بھی بلا کا تھا کہ جس بات کو

اور لوگ مہینوں میں حاصل کرتے اُس پر وہ چند دنوں کی محنت میں حاوی ہوجاتے تھے، اُن کا معیارِ خیال بہت اونچا، اُن کا مطمحِ نظر بلند، اور رفیع تھا، اُن کی پسند مشکل ہوتی تھی۔ نظرؔ کے پختہ کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

ضبط سے دل نزار رہتا ہے — اندرونی بخار رہتا ہے
دلِ اہلِ حقیقت و عرفاں — زندہ زیرِ مزار رہتا ہے
یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا — اب بہت بے قرار رہتا ہے
اُن کے تیور کو دیکھتا ہے یہ دل — اور اُمیدوار رہتا ہے
قطعِ اُمید ہو تو صبر آ جائے — روز اک انتظار رہتا ہے
خاکِ مدفن نہ بادِ تند اُڑا — کہ یہاں خاکسار رہتا ہے

مایۂ زندگیِ سخن ہے نظرؔ
شعر ہی یادگار رہتا ہے

(اس غزل میں تیسرے شعر کا دوسرا مصرع بالخصوص دادطلب ہے)

جب وہ سرمایۂ نشاط نہیں — پھر ہمارے لئے خوشی کیسی
ہوئی کس کی نگاہ کو جنبش — دل پہ بجلی سی یہ گری کیسی
درد اُٹھ اُٹھ کے کچھ بتاتا ہے — دل پہ کیا جانئے بنی کیسی

یہ تجربے ہوئے اس دل کو تحطِ اُلفت کے — وطن میں لطف اب آنے لگے ہیں غربت کے
نہ مجھے لحد میں بھی جا کر نہ داغ فرقت کے — گواہ حال ہیں ذرّے زمینِ تربت کے
جو زندہ ہیں تو یہیں دیکھ لیں گے جلوہ دوست — وہ ہم نہیں کہ رہیں منتظر قیامت کے

کارگر ہو کوئی تدبیر نہ جب مرنے کو — مے پیو تم غمِ ایّام غلط کرنے کو
چارہ سازانِ محبت کو یہ جلدی کیوں ہے — ایک مدت ہے ابھی زخمِ جگر بھرنے کو
ذہنِ گورسے آتی ہے بشر کو یہ صدا — کوئی گوشہ ہے بہت عمر بسر کرنے کو

نظر نے مجذوب کی بڑ کے عنوان میں چند اشعار لکھے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

پئے سیر و تماشا کیا تم اس گلزار میں آئے
ہوئے گل کے نہ چشم نرگسِ بیمار میں آئے

سمائے چشمِ عاشق میں حبیب اک بات ہو لیکن
مزا جب ہو نظر عاشق نگاہِ یار میں آئے

کرو گر تم چمن کی سیر چشمانِ بصیرت سے
نظر دانہ میں دیکھو اور نظر گل خار میں آئے

دُوئی کو گر مٹا دے تو خودی کو گر اُڑا دے تو
تو شکلِ یار پھر تجھ کو نظر اغیار میں آئے

کہاں تھے ہم یہیں تھے اور یہیں ہونگے جہاں جائیں
کہاں جائیں نظر ہر شے جو شکلِ یار میں آئے

نہیں ہو یہ مقام آہ و بکا حرص و ہوا کی جا
رہے بس دم بخود بلبل گر اس گلزار میں آئے

تو اے اشکالِ گوناگونِ عالم کے تماشائی
بتا تو ہی یہ سب نیرنگیاں کس رنگ سے چھائی

گل و سنبل یہ کیا ہیں باغ کیا ہے، کون مالی ہے
کبھی گلزارِ عالم میں یہ سوچا تو نے سودائی

کبھی سنبل سے اُلجھا دیکھی نرگس بولا سوسن سے
نہ سمجھا رازِ معنی کو تو اے صورت کے شیدائی

گیا کھل دیکھ کر گل کو دیا رو سن کے بلبل کو
حواسوں کے فسوں کی سیر ناداں تجھ کو کیا بھائی

عیاں کثرت میں ہو وحدت نہاں وحدت میں کثرت ہو
یہ ہو لا شرک کی شان اور یہ ہو اندازِ یکتائی

شہود و شاہدِ اصلی مشاہد میں نظر آ کر لے
جو حاصل ہو تری چشم دروں کو نورِ بینائی

بتوں کی شکلِ زیبا پہ تو کیا مفتون و شیدا ہے
محیطِ کل نے کب مصنوعی زنداں میں جگہ پائی

ڈھنڈھورا شہر میں لڑکا بغل میں ہو مثل تیری
دکھائی دے جو دیکھے آپ میں وہ شکل رعنائی

یونہی دیکھو تو دنیا ایک ناٹک کا فسانہ ہے
نظر ہو اصل پہ تو پھر حقیقی کارخانہ ہے

نظر اردو کے ایک کہنہ مشق ادیب اور ذہین شاعر تھے۔ ہم نے ان کا کلام مختلف رسائل میں اکثر دیکھا ہے۔ زبان کی صفائی، الفاظ کی بندش، تراکیب کی چستی مشاقی کا ثبوت دیتی ہے۔ مگر ہم یہ بھی کہیں گے کہ اُن کے تخیل میں بلندی اور ان کے کلام میں مضمون آفرینی کم ہے، پھر بھی ادب اردو اُن کا بہت کچھ مرہونِ احسان ہے۔ زمانہ میں وقتاً فوقتاً اُن کے ایسے تنقیدی مضامین نکلے جو پڑھنے والوں کے لئے ہمیشہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم کو تعجب ہے کہ مسٹر بابو رام سکسینہ ایم۔اے۔ ایل ایل بی نے ادب اردو کی تاریخ لکھی، اور نظر کے کارناموں کو فراموش کر دیا۔

سرور

منشی درگا سہائے نام، سرور تخلص، جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کے "ادیب" میں سرور کی موت پر ان الفاظ میں ماتم کیا گیا تھا۔ جو ہم بجنسہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے مرحوم کے کچھ حالات معلوم ہوں گے۔ اور اس امر کا بھی پتہ چلے گا کہ ادبی دُنیا میں اُن کی بے وقت موت نے کیا ستم ڈھایا ہے۔

"یہ خبر نہایت رنج و قلق کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۳ر دسمبر سنہ حال کو اردو کا وہ خوش نوا شاعر جس کی دلکش شاعری نے نظم اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا، جس کے درد بھرے اشعار میں سوز و گداز کی رُوح کھنچ گئی تھی اور جس کی نازک خیالی نغز گوئی اور حاضر طبعی کے افسانے بالکل تازہ ہیں۔ ۳۷ سال کی عمر میں دفعتاً اُس دارِ سرور کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں دنیوی رنج و راحت اور عیش و مصیبت کی کشمکش سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔"

یہ منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کا روح فرسا سانحہ ہے جو دُنیائے ادب کے لئے کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے۔ مرحوم قصبۂ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے ایک مقتدر خاندان کے ہونہار رُکن تھے اور اپنی تھوڑی سی عمر میں شہرت و ناموری کے آسمان پر اس قدر بلند ہو کر چمکے کہ ساری دُنیائے شاعری جگمگا اُٹھی۔ مرحوم کو شاعری کے علاوہ فنِ حکمت میں بھی دستگاہ حاصل تھی، اور یہ اُن کا آبائی پیشہ تھا، لیکن سب سے

زیادہ اُن کے خلقی اوصاف تھے، جن میں نیک نفسی، منکسر مزاجی اور راستبازی کو
مرحوم کی طبیعت میں حیرت انگیز درجہ تک دخل تھا، مرحوم کی نہایت زبردست
آرزو اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت تھی جو افسوس کہ اُن کی موت سے ایسے
وقت میں معدوم کر دی جبکہ اس کے بر آنے میں صرف چند ہفتے باقی
رہ گئے تھے۔"

جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے۔ سُرورؔ جہان آباد (ضلع پیلی بھیت)
کے کایستھ تھے۔ اور ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اوائل عمر میں اُنھوں
نے اردو فارسی خوب پڑھ لی تھی اور چونکہ کتب بینی کی عادت تھی، اس لئے
روز بروز استعداد علمی میں اضافہ ہوتا رہا، ان کی مالی حالت زیادہ اچھی
نہ تھی، زمانہ اور صاحب زمانہ نے اُن کی نہ صرف ہمت افزائی کی بلکہ اُن کو
کام کرنے کی راہ بتائی اور ان کی شہرت پر چار چاند لگائے۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ مرحوم میں جوہر قابل موجود تھا۔ لیکن اس جوہر کو جلا دینے والا
صاحب زمانہ کا ہاتھ تھا، جو آج تک ملک اور ادب کی خدمت میں مصروف کار
ہے، تھوڑی بہت شراب تو سرور ہمیشہ پیتے تھے، مگر رفتہ رفتہ اس آتش سیال
نے اُن کے دل و دماغ کو جلا کر خاک کر دیا تھا، اور اغلباً یہی مہلک عادت
۱۹۱۰ء میں قبل از وقت موت کا باعث ہوئی۔

مرحوم کا کلام جامِ سرور کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے چھپ کر
شائع ہوا تھا۔ اور ملک کے متعدد افراد نے ان موتیوں کو آنکھوں سے
لگایا تھا۔

شاعر کی حیثیت سے سرور کا رتبہ بلند ہے، اور اگر وہ اس قدر قبل
از وقت فوت نہ ہوتے تو یقیناً اپنے زمانہ کے ایک قادر الکلام اُستاد
مانے جاتے۔ افسوس ہے کہ موت نے اُن کو مہلت نہ دی اور نہ زمانہ کی
ستم آرائیوں سے اُنھیں فرصت حاصل ہوئی، اس لئے اُن کے کلام کا

زیادہ حصہ زمانہ اور ادیب میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ کبھی افق مخزن پر
بھی یہ برق چمکی اور دل دادگانِ ادب کے دلوں کو جگمگا گئی۔

شوکتِ الفاظ، رنگینیِ جذبات، نازک خیالی، اور مضمون آفرینی سرور کا
حصہ ہی۔ اور ان کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو بلاشبہ چوٹی کی نظمیں مانی جاتی ہیں
مثلاً ان کی ایک نظم "بیر بہوٹی" کے نام سے ادیب میں شائع ہوئی تھی اسکے
چار بند ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں کہ آپ خود اندازہ کریں کہ ایک چھوٹی سی
ہستی کو سرور نے کہاں پہنچا دیا ہی

ہی عجب انداز تیرے حسن بے انداز کا — سُرخ ڈورا ہی کسی چشمِ فسوں پرواز کا
قطرۂ مضطر ہی خونِ کشتگانِ ناز کا — قلبِ خوں گشتہ ہی مژگاں پر کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑہ ہی زمیں پر جلوہ گر
جامِ زریں میں ہی صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہی شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن — خونِ عاشق یا زمیں پر ہی گریباں گیرِ حسن
یا عقیقِ سرخ کی چھوٹی سی ہی تعمیرِ حسن — نقشِ نیرنگ فسوں ہی یا کوئی تصویرِ حسن

جلوۂ گل ہی فضائے وادیِ پُر خار میں
سُرخ تکمہ ہی قبائے سبزۂ کہسار میں

جلوۂ گل سے ہی رنگیں روئے زیبائے بہار — نازنیں ہی یا کوئی محوِ تماشائے بہار
یا مئے گلرنگ سی گلگوں ہی مینائے بہار — یا ہی آغشتہ بخوں داغِ سویدائے بہار

سبزۂ کہسار نے یا لعل ہی اُگلا کوئی
چُن رہی ہی پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

وادیِ پُر خار میں اک مجمرِ سوزاں ہی تو — دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہی تو
کشت زارِ حسن میں اک دانۂ مرجاں ہی تو — یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہی تو

ناز ہی صحرا کو تیری شوخیِ رفتار پر
دوڑتا ہی خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

سرور کی دو نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

"گل خزاں دیدہ"

خوشا وہ دن کہ میں آرائشِ صحنِ گلستاں تھا
خوشا وہ دن کہ میری فرق پر تاجِ زر افشاں تھا

صبا گہوارہ جنباں قصہ گو بانگِ عنا دل تھی
مرا چھوٹا سا بستر خوابِ آرائش کا ساماں تھا

فضائے لالہ و ریحان و گل پریوں کی محفل تھی
نسیمِ صبح کا جھونکا جو تھا تختِ سلیماں تھا

ترنم ریز تھا شاخوں پہ میری طائرِ سدرہ
چمن کا میرے دست آموز اک مرغِ غزلخواں تھا

جوابِ خطۂ کشمیر میرا کنجِ دلکش تھا
بہارِ سبزۂ گل تھی ہجومِ سرو و ریحاں تھا

ادھر سنبل کو تھا نازِ اپنے گیسوئے مسلسل پر
ادھر نرگس کو گلشن میں غرورِ چشمِ فتاں تھا

کلی دوشیزۂ ناکتخدا اک اک تھی گلشن میں
شگوفہ جو چمن میں تھا عروسِ گل بداماں تھا

کہاں لائی اُڑا کر آہ تو بادِ خزاں مجھ کو
کہیں خارِ مغیلاں تھے کہیں غولِ بیاباں تھا

بہارِ عالمِ نیرنگ تھی ہر ایک گھڑی میری
نہ تھا معلوم رنگِ انقلابِ دہر پنہاں تھا

حقیقت کھل گئی دورِ خزاں آیا جو گلشن میں
نہ تھا غازہ رُخِ گلرنگ پر خونِ شہیداں تھا

تحیّر زا تھا منظر آہ اک اک باغِ ہستی کا
وجودِ عالمِ امکاں مگر خوابِ پریشاں تھا

"مارِ یاسمیں"

آ! کلیجے سے لگا لوں تجھ کو مارِ یاسمیں
ہیں کسی گیسو کے خم تجھ میں کسی ابرو کی چیں

یہ قیامت سی شکن اور یہ بلا کے پیچ و خم
آہ! کس کافر ادا کی تو ہی زلفِ عنبریں

ہی ترے حسنِ سیہ سے دل کو اک دلبستگی
قیس میں ہوں آہ تو ہی لیلیِ محمل نشیں

آہ ظالم اُف رہی تیری گرمیِ جانسوزِ حسن
دل کو پھونکے دیتی ہی تیری نگاہِ آتشیں

مجھ کو وہ لذت ہی ملتی آہ تیرے نیش میں
میں سمجھتا ہوں کہ ہی تیری لَے بال میں انگبیں

شب کو پانی سے دلھن بنکر نکلتا یوں ہی تو
بال کھولے گھر سے نکلے جیسے کوئی مہ جبیں

گرمیوں میں جیسے صندل ہی حسینوں کو پسند
ڈھونڈھتا پھرتا ہی یونہی تو کبھی شاخِ صندلیں

پھن اُٹھا کر آہ مستی میں وہ لہرانا ترا
جیسے ہو جوبن کی متوالی کوئی نازآفریں

سبزہ زاروں میں ہی شب کو اک عروسِ بے نقاب
دن کو پانی میں ہی تو اک شاہدِ پردہ نشیں

او فسوں گر آہ ہوں میں کشتۂ زلفِ دراز
مجھ کو ڈس لے تیرے ڈسنے کا مجھے شکوہ نہیں

تجھ سے میرے گیسوؤں والے کی ملتی ہی ادا
میری نظروں میں تو ہی تو حسینوں کا حسیں

او ستمگر آہ اک کالا سمجھتا ہوں تجھے
میں تو اپنا گیسوؤں والا سمجھتا ہوں تجھے

ایک اور نظم جو "حسرت دیدار"[1] کے نام سے شائع ہوئی ہی اس قابل ہی کہ تمام و کمال پڑھی جائے، نظم بہت طویل ہی، اس لئے ہم اس کو پوری نقل نہیں کر سکتے۔ البتہ چند بند ناظرین کی تفننِ طبع کے لئے پیش کرتے ہیں ان کو سرور کی سحر کاری کا ایک اچھا نمونہ کہنا چاہئے، ان میں تخیل کی بلند پروازی اور الفاظ کی روانی خاص طور پر قابل التفات ہیں۔

وہ طرۂ زرافشاں وہ تاجِ شہریاری
وہ شانِ کج کلاہی وہ فخرِ تاجداری

---

[1] اس نظم میں شاہجہاں جنت مکاں کے اُن جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہی جو قید اور معزول ہو جانے کے بعد اُس کے دل میں موجزن ہوتے تھے۔

ممتاز! اُف وہ تیری دیرینہ غمگساری — وہ تیری جاں نوازی وہ میری جاں نثاری

قصہ کہانیاں ہیں باتیں وہ اب کہاں ہیں

اے حسن و عشق تیری گھاتیں وہ اب کہاں ہیں

بے نام و بے نشاں ہوں بے تاج و بے نگیں ہوں — پامال ہو چکا جو وہ نقشِ دل نشیں ہوں

اک ننگ ہوں نارِ حجرے میں آہ اب مکیں ہوں — فریادِ آتشیں ہوں دُودِ دلِ حزیں ہوں

پُتلا ہوں آہ اب میں سوزِ غمِ نہاں کا

رگ رگ میں مشتعل ہے شعلہ مری فغاں کا

جمنا کی اُف وہ موجوں کا دلفریب منظر — جھونکے ہوا کے بھینے بھینے وہ رُوح پرور

وہ چاندنی کا آنچل پھیلا ہوا زمیں پر — فوّاروں کا اُچھلنا پھولوں کی نکہتِ تر

اک چاند کا نکھرنا اک چاند کا سنورنا

ہنس ہنس کر شہید مجھ کو تیغِ ادا سے کرنا

مُرجھا رہے ہیں جو یہ گل تیرے مزار پر ہیں — سوزِ دروں کا مرہم جانِ دل و جگر ہیں

پیمانِ میں ہی وفا کی یہ میرے چارہ گر ہیں — راحِ مشامِ جاں ہیں دامن کشِ نظر ہیں

یہ ان گلوں کی نازک نازک جو پنکھڑیاں ہیں

مہندی بھری یہ تیری گویا ہتھیلیاں ہیں

اشجار جھومتے ہوں شاخیں لچک رہی ہوں — خوشبو ہو بھینی بھینی کلیاں مہک رہی ہوں

شبنم کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی ہوں — سبزے پہ موتیوں کا پانی چھڑک رہی ہوں

مصروف آہ ہم تم گلگشتِ باغ میں ہوں

دامن میں پھول چُنتے کنجِ فراغ میں ہوں

وفات سے دو تین ماہ قبل سرور کی ایک نظم "سودائے عشق" کے نام سے شائع ہوئی تھی، اس کو شاعر نے اس طرح شروع کیا ہے ؎

مے سوزِ عاشقی کا جو نصیب جام ہوتا — میں سحر کو بھی نہ بجھتا وہ چراغِ شام ہوتا

وہ جگر کا داغ بنتا دمِ حشر بھی نہ مٹتا — دل و جاں کو پھونکتا رہ تپِ دوام ہوتا

نہ میں بجھنے والا شعلہ نہ شرار خام ہوتا

شب غم میں بنکے ٹپکی کسی چشم تر سے آنسو
میں نہوں سحر کا تارا نہیں مجھ کو یہ گوارا

شب تار میں چمکتا نہ ہوا یہ بن کے جگنو
جو فروغ عشق دیتا مجھے چرخ فتنہ آرا

میں جگر پہ داغ کھا کھا کے یہ تمام ہوتا

آگے چل کر کہتے ہیں ؎

نہ کسی کی نوک مژگاں کی خلش جگر میں ہوتی
نہ کمند شوق حلقے کسی زلف عنبریں کے

شب غم میں تیرہ دُنیا نہ مری نظر میں ہوتی
نہ زمانہ بھر کے جھگڑے نہ بکھیڑے ہوتے دیں کے

مجھے تجھ سے کام ہوتا تجھے مجھ سے کام ہوتا

نہ چمن میں گل کا شیدا نہ میں عندلیب ہوتا
نہ فلک سی برق گرتی مری شاخ آشیاں پر

ترا داغ سوز الفت جو مجھے نصیب ہوتا
میں شرار بن کے اڑتا شب غم میں آسماں پر

نہ ہلال عید بنتا، نہ سر صیام ہوتا

سرور کی موت دراصل اردو شاعری کے لئے ایک سخت حادثہ تھا۔ انکے کلام میں جو کہیں کہیں خامیاں پائی جاتی ہیں وہ محض اس وجہ سے ہیں کہ مشق سخن زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی۔ ۲۷ سال کی عمر میں انتقال کیا اور برابر تفکرات و تردّدات میں غلطاں و پیچاں رہے۔ غنچۂ دل کبھی شگفتہ نہ ہوا۔ آلام دنیوی سے کبھی نجات نہ ملی۔ اسی وجہ سے کلام میں سوز و گداز کا عنصر غالب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شکوہ الفاظ، حسن بندش اور نیرنگی جذبات نے ان کی نظموں میں ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ان کی ایک نظم "ستی" ہے جس کو میں ان کا شاہکار سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ پوری نظم پڑھی جائے اسی وجہ سے اس کا اقتباس ناظرین کی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا۔

سرور کے ماتم میں محشر نے ایک نہایت دردناک نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ ؎

اے سرور نکتہ سنج اے ملک کے صاحب کمال

اے مرے نادیدہ دوست اے شاعر نازک خیال
او ادیبِ نکتہ پرور اور مددگار ادیب
حشر تازہ ہو گیا ہے وقت تیرا انتقال
مرنے والے تیرے اوصاف حمیدہ کیا کہوں
حُسنِ سیرت اک طرف اور اک طرف حسنِ مقال
بھول جائیں دوست تیرے تجھ کو ممکن ہی نہیں
یاد جب آئے تری تجھ کو نہ روئیں کیا مجال

سرور کی تاریخ وفات جو آشرف صاحب نے لکھی تھی ملاحظہ ہو ؎

صد افسوس ! ہیہات دُرگا سہائے
در آغوشِ بیباکِ اجل چوں بخفت
ندا آمد آشرف بگو سالِ فوت
سرور از جہاں رفت تا صد گفت

چکبست

پنڈت برج نرائن نام، چکبست تخلص، یہی کشمیری فرقہ کا لقب، انکے بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے۔ یہ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ مگر انکی نشو و نما لکھنؤ ہی میں ہوئی، ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی، اے، کی ڈگری حاصل کی، اور ۱۹۰۷ء میں ال ال بی کا امتحان پاس کیا، وکالت شروع کی۔ اور اس پیشہ میں ان کو اچھی خاصی کامیابی ہوئی، ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو رائے بریلی کے اسٹیشن پر فالج گرا اور وہیں شام کے سات بجے انتقال کر گئے جناب محشر لکھنوی نے انھیں کے مصرع سے تاریخ وفات لکھی ہے

انھیں کے مصرع سے تاریخ ہو ہمراہِ عزا
"موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا"

چکبست کو شاعری کا شوق ابتدائے عمر سے تھا، انھوں نے پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی۔ آتش، غالب، اور انیس کے کلام کے خاص طور سے دلدادہ تھے اور سلاست زبان، بندشِ الفاظ اور حسن ترکیب میں انھیں اساتذہ کی پیروی کی۔ چکبست کے کلام میں تاثر و درد کے ساتھ ساتھ صفائی اور سادگی بھی خاص طور سے نمایاں ہیں، خیالات کی بلند پروازی مضامین کی تازگی نے اسپر چار چاند لگا دیے ہیں، اس کے علاوہ ان کے کلام میں غیر معمولی وسعت ہے اور ان جذبات کی بھی تصویر کھینچی گئی ہے جو بالعموم مشرقی شعراء نظر انداز کر دیتے تھے۔ مثلاً ؎

نذرِ رُوح

دلِ پُر درد کے ٹکڑے جو کئے ہیں یکجا تیرے قدموں کے لئے تھا یہی میرا تحفا
مگر افسوس کہ یہ دین ادا ہو نہ سکا اب سرِ لوح یہ ہے نقش یہ پیغام وفا

میرے سودائے طبیعت کا جو افسانہ ہے
مرنے والے یہ تری رُوح کا نذرانہ ہے

تلک

اُٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث	قوم مرحوم کے اعزازِ کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شیر دکن کا وارث	پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رَن کا وارث

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دَور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

چکبست کے قادر الکلام ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔ مگر اس قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ فطرت نے ان کو ایسا ذوق سلیم عطا کیا تھا جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ دیباچہ گلزار نسیم و تنقید داغ ان کے صحیح وجدان و خوش مذاقی کے بہترین ثبوت ہیں۔ بقول سر تیج بہادر سپرو۔

"چکبست کے کلام میں رنگینی و درد ہے، انسانی جذبات و محسوسات پر اس کا اثر بہ نسبت انسانی دماغ کے زیادہ پڑتا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ چکبست نے لکھنؤ کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی ہے اور ان پر ان اساتذہ کے کلام کا زیادہ اثر ہے جو لکھنؤ کی ناموری کا باعث ہوئے۔ برج نرائن چکبست کی شاعری اور کمال کے ان کے سب ہمعصر قائل ہیں۔"

(از دیباچہ صبح وطن)

رُباعیات میں بھی چکبست کو کمال حاصل تھا۔ ملاحظہ ہوں ؎

یہ قوم ذرا عاقبت اندیش نہیں	سودا تو ہے نوش کا سرنیش نہیں
پہلے کی ترقی سے ہیں کتنے پیچھے	افسوس ہمیں کچھ بھی پس و پیش نہیں
بیکار تعلّی سے ہے نفرت مجھ کو	لوں داد سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی	اک دن خود ڈھونڈھ لیگی شہرت مجھ کو

بو گل کے لئے ہو گل ہو شبنم کے لئے
اک ربط ہو انتظام عالم کے لئے
لیکن ہو مرا شباب ماتم کے لئے
غم میرے لئے ہو اور میں غم کے لئے

آبادی ہو اصل میں نہ ویرانہ ہو
شادی کا یہ گھر ہو نہ عزا خانہ ہو
واللہ مبتدا ہو اس کی نہ خبر
دُنیا اک نا تمام افسانہ ہو

غزلیات

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہو خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا
مقام کوچ کیا ہو منزلِ مقصود تک بھولے
قیامت تھا سرائے دہر میں دو دن ٹھہر جانا
بہت سودا رہا واعظ تجھے نارِ جہنم کا
مزا سوزِ محبت کا کبھی کچھ لے بے خبر جانا
مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا
سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید رُوح نے گردِ سفر جانا

دیگر

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہو یہی اور یہی انساں ہونا
زندگی کیا ہو عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہو، انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
ہم کو منظور رہو اے دیدۂ وحدت آگیں
ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا
جس طرح خم سے کسی جام کا ٹکڑہ نکلے
یونہی گردوں سے سرِ نو کا نمایاں ہونا
سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیڑی نہ رہی
میری تقدیر میں تھا بے سر و ساماں ہونا

صفحۂ دہر پہ مُہرِ یدِ قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

ہو بیاضِ سحرِ نور پہ دل کیا مائل — یاد ہو دفترِ انجم کا پریشاں ہونا

کل بھی وہ گل جو ہو فردائے قیامت کا اثر — اور پھر اُس کے لئے آج پریشاں ہونا

پاؤں زنجیر کے مشتاق ہیں ای جوشِ جنوں — ہے مگر شرط ترا سلسلہ جنباں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک — ہے اسے طرّۂ دستارِ غریباں ہونا

ہو مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر — ننگ ہو میرے لئے چاک گریباں ہونا

دیگر

مری بیخودی ہو وہ بیخودی کہ خودی کا وہم و گماں نہیں
یہ سرورِ ساغرِ مے نہیں، یہ خمارِ خوابِ گراں نہیں
جو ظہورِ عالمِ ذات ہو، یہ فقط ہجومِ صفات ہو
ہو جہاں کا اور وجود کیا جو طلسمِ وہم و گماں نہیں
یہ حیات عالمِ خواب ہو نہ عذاب ہو نہ ثواب ہو
وہی کفر و دیں میں خراب ہو جسے علمِ رازِ جہاں نہیں
نہ وہ خم میں بادہ کا جوش ہو نہ وہ حسنِ جلوہ فروش ہو
نہ کسی کو رات کا ہوش ہو وہ سحر کو شب کا سماں نہیں
یہ زمیں پہ جن کا تھا دبدبہ کہ بلند عرش پہ نام تھا
اُنھیں یوں فلک نے مٹا دیا کہ مزار تک کا نشاں نہیں

دیگر

کچھ اور ہی ہو وہ شاعرِ معجز بیاں نہیں — جس کے سخن سے رنگِ طبیعت عیاں نہیں

اظہارِ درد غیر سے کرتے ہیں بوالہوس — ہم کو دماغِ نالہ و آہ و فغاں نہیں

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا بدل گئی — واللہ وہ زمیں نہیں آسماں نہیں

دیگر

دل کے لئے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے — حبِ قومی ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے

جانچتا ہوں وسعتِ دل حملۂ غم کے لئے — امتحاں ہو رنج و حرماں کی فراوانی مجھے
قوم کا غم مول لیکر دل کا یہ عالم ہوا — یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے
ذرہ ذرّہ ہو مرے کشمیر کا مہماں نواز — راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہو — دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہو
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہو — اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہو

ہر صبح ہو یہ خدمت خورشیدِ پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہو چوٹی ہمالیہ کی

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو — سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُنکی ہڈّیاں ہیں

برسوں سے ہو رہا ہو برہم سماں ہمارا — دُنیا سے مٹ رہا ہو نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا — اک لاشِ بے کفن ہو ہندوستاں ہمارا

اس کے بھرے خزانے برباد ہو رہے ہیں
ذلّت نصیب وارث غفلت میں سو رہے ہیں

ہو جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہو جلوہ اس انجمن کا
ہو رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا — تُلتا ہو برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہو اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

رامائن کا ایک سین

کیا جانے کس خیال میں گم تھے وہ بےگناہ   نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ   لی گوشہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا   افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا   وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

سنکر زباں سے ماں کی یہ فریادِ دردخیز   اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز   لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال   ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہوا اب محال
ہو کبریا کی شان گذرتے ہی ماہ و سال   خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحۂ ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں   ہے دن کو دھوپ رات کو شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگِ باغ بدلتا ہے ناگہاں   وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں

رکھتے تھے جو عزیز انہیں جان کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر   صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر

جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر　　　رہتا نہیں وہ حال سے بندہ کے بیخبر
اس کا کرم شریک اگر ہو تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

برسات

یاد دلواتی ہے نوشی فضا برسات کی　　　دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی
بندھ گئی ہے رحمتِ حق سے ہوا برسات کی　　　نام کھلنے کا نہیں لیتی گھٹا برسات کی
اُگ رہا ہے ہر طرف سبزہ در و دیوار پر　　　انتہا گرمی کی ہے اور ابتدا برسات کی
دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آ گئی　　　حق میں ہے یہ دل کے مسیحا ہے ہوا برسات کی
ہوں شریکِ بزم سے زاہد بھی توبہ توڑ کر　　　جھومتی قبلہ سے اُٹھی ہے گھٹا برسات کی
اصل تو یوں ہے کسی معشوق کا جب لطف ہے　　　چاندنی ہو رات کو دن کو گھٹا برسات کی
وہ پپیہوں کی صدائیں اور وہ موروں کا رقص　　　وہ ہوائے سرد اور کالی گھٹا برسات کی
پار اُتر جائیں گے بحرِ غم سے رندِ بادہ نوش　　　لے اُڑے گی کشتیِ مے کو ہوا برسات کی
خود بخود تازہ اُمنگیں جوش پر آنے لگیں　　　دل کو گرمانے لگی ٹھنڈی ہوا برسات کی
وہ دعائیں مے کشوں کی اور وہ لطفِ انتظار　　　ہائے کن نازوں سے چلتی ہے ہوا برسات کی
میں یہ سمجھا ابر کے رنگین ٹکڑے دیکھ کر　　　تختِ پریوں کے اُڑا لائی ہوا برسات کی
ناز ہو جس کو بہارِ مصر و شام و روم پر　　　سرزمینِ ہند میں دیکھے فضا برسات کی

نذرانۂ روح

(پنڈت بشن نرائن مرحوم)

دلِ پُر درد کے ٹکڑے جو کئے ہیں یک جا　　　تیرے قدموں کے لئے تھا یہی میرا تحفہ
مگر افسوس کہ یہ دین ادا ہو نہ سکا۔　　　اب سرِ لوح یہ ہے نقش یہ پیغامِ وفا
میرے سودائے محبت کا جو افسانہ ہے

مرنے والے یہ تری رُوح کا نذرانہ ہی

تیرا بندہ رہے دل سے یہی پیمان رہا
طائرِ فکر ترے اوج سے حیران رہا

قدر کرنا تری سیکھیں یہی ارمان رہا
یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہو تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہو کسی کامل کی پرستش کرنا

اب پرستش کو ہو باقی تری ہستی کی مثال
دل کے مندر کا اُجالا ہو یہ تصویرِ کمال

گو کہ یہ رُوح کا سودا ہو بلا خوفِ زوال
مگر اس خاک کے پُتلے کی ہو تسکین محال

یاد مٹتی نہیں تیری دریِ حیرت کدا ہو
ہم کو معلوم ہوا آج یتیمی کیا ہو

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا
حسرت آباد جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا

میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا
زندگی کی یہی دولت ہو یہی سرمایا

لیکے دُنیا سے یہی مہر و وفا آیا ہوں
اپنے محسن کے غلامی کی سند لایا ہوں

چکبست کے کلام میں متانت اور پختگی بندش کے علاوہ اُستادانہ رنگ کی جھلک موجود ہی۔ قومی درد ان کے اشعار کی نمایاں خصوصیت ہی، اور کیا اس سے انکار ہو سکتا ہو کہ ہندوستان کو اس وقت ایسے ہی شعرا کی ضرورت ہی۔ گل و بلبل کے افسانے، زلف و چوٹی کے قصے ہم ضرورت سے زیادہ عرصہ تک دُہرا چکے ہیں اور اب تک ہم نے شاعری سے قومی کام بہت کم لیا ہی۔ ضرورت ہو کہ اب شاعری کا رنگ بدلے، اور پبلک کے دلوں کو گرمایا جائے۔

چکبست اور اقبال اس وادی کے امام ہیں لیکن جس قدر زمانہ گذرتا جاتا ہی، اقبال کے کلام میں فلسفہ غالب ہوتا جاتا ہی۔ یہ امر یقینی ہو کہ اس دور کا کوئی ہندو شاعر لطافتِ بیان نازک خیالی، پختگی اور اسلوب کی صفائی میں چکبست کا مدّمقابل نہیں۔

برق

منشی مہاراج بہادر نام، برق تخلص، بزرگوں کا وطن سکیٹ ضلع ایٹہ تھا، مگر کئی پشت سے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کے دادا منشی خوب چند مغل حکومت کے آخری دور میں شاہی وکیل تھے۔ آپ کے پدر بزرگوار کا نام منشی ہر نرائن تھا، وہ بھی شاعر تھے اور حسرت تخلص کرتے تھے۔

برق کا سنہ پیدائش ۱۸۸۴ء ہے۔ ذوق شاعری اوائل عمر ہی سے تھا مگر آپ کے والد کی سخت تاکید کی تھی کہ جبتک انٹرنس کا امتحان نہ پاس کر لو شعر و شاعری کے پاس بھی نہ جاؤ۔ ۱۹۰۵ء میں آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا، اس وجہ سے آپ کی تعلیم نامکمل رہ گئی تھی، مگر آپ نے گھر پر مطالعہ برابر جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۸ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۰ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں اکاؤنٹس کا امتحان پاس کر کے پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ آپ کا مجموعۂ کلام "مطلع انوار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ابتدا میں چند غزلیں آغا شاعر قزلباش کو دکھائیں۔ فروری ۱۹۳۶ء میں آپ کا یکایک انتقال ہو گیا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

دل جو صورت گرِ معنی کا صنم خانہ نہ بنے   آنکھ جس شے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے

اتنے ہی ہو گئے ہم منزلِ عرفاں کے قریب   جس قدر رسم و رہِ دہر سے بیگانہ بنے

تا درِ یار پہنچتا ہے وہ خود رفتۂ شوق   اپنی ہستی سے جو اس راہ میں بیگانہ بنے

ظرفِ مے ٹوٹ کے بھی ہونے نہ پائے بیکار   ہو شکستہ کوئی شیشہ تو وہ پیمانہ بنے

سعیِ ناکام سے میں ہاتھ اٹھاؤں گا نہ برق
میری بگڑی ہوئی تقدیر بنے یا نہ بنے

لذتِ گویائی کیا مستور خاموشی میں ہے   ایک محویت کا عالم خود فراموشی میں ہے

کھیل قسمت کے زمانہ کی دورنگی دیکھئے ‏ ‏ ‏ ‏ کوئی صرفِ غم ہے کوئی شغلِ مینوشی میں ہے
خود حجابوں سے نہاں ہے اور جلوے بےحجاب ‏ ‏ ‏ ‏ حسنِ مطلق تیری روپوشی بھی رونوشی میں ہے
زندگی کی کشمکش کا راز مفہومِ سکوں ‏ ‏ ‏ ‏ دل کے ہنگاموں میں ہے راتوں کی خاموشی میں ہے

برق طرزِ جدید کے پیرو ہیں۔ وہ تمام خصوصیات شاعری جو ایک قادر الکلام شاعر کے یہاں ملتی ہیں برق کے یہاں بدرجۂ کثیر موجود ہیں۔ تاثیر، فصاحت، سلاست، نادر تشبیہات وغیرہ آپ کے کلام میں جگہ جگہ عیاں ہیں۔ زبان کی شستگی اور برجستگی بھی قابلِ داد ہے۔ نیچرل نظمیں خوب کہتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں رسالۂ "زمانہ" میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی ایک نظم "کرمکِ شب تاب" انتہائی دلکش ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خندۂ جامِ بلوریں ہے ہوا میں پرّاں ‏ ‏ ‏ ‏ گرمِ پرواز ہے یا پرتوِ شاخِ مرجاں
محوِ پرواز یہ لعلِ یمنی ہے شاید ‏ ‏ ‏ ‏ اُڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید

نظم "بچہ کی گلابی مسکراہٹ" کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں ؎

خندۂ گل میں یہ رنگینی کہاں ‏ ‏ ‏ ‏ یہ لطافت یہ شیرینی کہاں
اس صباحت پر یہ نمکینی کہاں ‏ ‏ ‏ ‏ اسمیں ہے جانِ سخن چینی کہاں

ختم ہے اس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

ہلکی ہلکی تیرے ہونٹوں پہ ہنسی ‏ ‏ ‏ ‏ خندۂ نازآفریں کی شان ہے
حسن ان کا زندگی کی جان ہے ‏ ‏ ‏ ‏ تجھ سے روکش ہوں یہ کب امکان ہے

ختم ہے اس لب پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

ہلکی ہلکی تیرے ہونٹوں پہ ہنسی ‏ ‏ ‏ ‏ مایۂ فرحت ہے جانِ زندگی
موجِ رقصاں ہے صفائے قلب کی ‏ ‏ ‏ ‏ اسمیں قدرت نے بھری ہے دلکشی
ختم ہے اس لعل لب پر واہ وا ‏ ‏ ‏ ‏ یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

برق کی دوسری نظم "شانِ حق" ملاحظہ ہو ؎

شیرازہ بندِ دفترِ امکاں ہے شانِ حق
سرچشمۂ حیات ہے فیضِ روانِ حق
سیراب ابرِ لطف ہیں سب تشنگانِ حق
ذرّے زبانِ حال سے ہیں ترزبانِ حق
حق کی صدا ہے پردۂ ہستی کے ساز میں
درپردہ بس رہی ہے حقیقت مجاز میں

زینت فزائے عالمِ اسباب ہے وہی
شانِ فروغِ ماہِ نظرتاب ہے وہی
رنگینیِ رُخِ گلِ شاداب ہے وہی
ضوبخشِ برقِ غیرتِ سیماب ہے وہی
حق کی ضیا سے نور کا مطلع عیاں ہے
ذرّوں میں آفتابِ درخشاں کی شان ہے

رُوئے مجاز عکس ہے حق کی صفات کا
پرتو اس آئینہ میں ہے انوارِ ذات کا
حق اصلِ کل ہے سلسلۂ کائنات کا
اعجازِ حق ہے رازِ طلسمِ حیات کا
ظلمت سرائے دہر میں ہے حق کی روشنی
جلوہ فشاں ہے قادرِ مطلق کی روشنی

زیبِ ریاضِ دہر اگر فیضِ حق نہ ہو
رنگیں کتابِ خندۂ گل کا ورق نہ ہو
نیرنگِ ہفت رنگِ بہارِ شفق نہ ہو
عالم فروزِ تابشِ مہرِ افق نہ ہو
اس تیرہ خاک داں میں برستا جو نور ہے
حق تو یہ ہے یہ جلوۂ حق کا ظہور ہے

دنیا میں ذاتِ حق سے یہ سب بندوبست ہے
انجامِ حق ہی ہستیِ فانی میں ہست ہے
کذبِ وریا کو حق کے مقابل شکست ہے
تابش سے حق کی تیرگیِ کفر پست ہے
رکھتا ہے اصل بیش حقیقت دروغ کیا
باطل کو حق کے سامنے ہوگا فروغ کیا

ریشؔ

منشی سکھ دیال سکسینہ نام، ریشؔ تخلص، دسمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم دو ڈھائی سال تک گھر پر ہوئی۔ ۲۳ سال کی عمر میں ایم اے ایل ایل بی پاس کر کے تعلیم سے فارغ ہوئے۔ ذہانت، بلند نگاہی، وسعت خیال اور تیزی طبع ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ شاعری کا مادّہ بھی عطیۂ فطرت تھا۔ انگریزی زبان کے شعرا کا کلام انھوں نے نہایت غور و خوض سے پڑھا تھا اور اسی مطالعہ کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو شعرا کے کارناموں کو بھی پڑھتے جاتے تھے۔ فلسفۂ مغرب میں بھی کافی مہارت حاصل تھی اور مطالعہ کا یہ ذوق و شوق آخر دم تک رہا۔ بہت خوش فکر اور عالی دماغ نوجوان تھے۔ مگر افسوس اور صد افسوس کہ ۱۶ اگست ۱۹۲۱ء کو عین عالم شباب میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی ذات ستودہ صفات سے ملک کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مرحوم کا جس قدر کلام اردو فارسی کا موجود ہے وہ زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے لیکن اُس میں متعدد نظمیں از قسم قصیدہ، مثنوی، رباعیات، قطعات وغیرہ بھی ہیں اُن کی ایک نظم "کھلایا ہوا پھول" ۱۹۱۱ء میں ادیب کے صفحات پر شائع ہو چکی ہے۔ دوسری نظم "کمالِ حسن" بھی اسی رسالہ میں شائع ہوئی۔ نام و نمود اور شہرت سے سراسر بے نیاز تھے۔ ان کے کلام کا بہت کم حصہ ایسا ہے جو شائع ہو کر پبلک تک پہونچ سکا، ریشؔ کے کلام میں پختگی نہیں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی استاد کامل اُن کے کلام پر نظر ثانی نہ کر سکا، مگر سوز و گداز اور فلسفہ کی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے اور اسی وجہ سے اُن کا تقریبًا ہر شعر پُر اثر اور دل پذیر معلوم ہوتا ہے۔ اشعار کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

بس دیکھ لی تیری یہ فرو مائگی حیات
لائی تھی کس فریب سے دنیا میں کھینچ کر

آئے تھے تیرے کوچے میں بچنے کو اجل سے
یاں آکے جو دیکھا تو اجل ڈھونڈھ رہی ہے

ابھی اے مرگ تو نے کر دیا زیرِ زمیں مجھ کو
ابھی تھا دوستوں میں میں بزیرِ آسماں بیٹھا

نام تو چھوڑ گئے اپنا ہما و عنقا
ہم وہ معدوم ہوئے نام و نشاں کچھ بھی نہیں

ہم ہیں سراپا شکلِ غم صورتِ رنج سر بسر
بزمِ نشاط و عیش میں کوئی ہمیں بلائے کیوں

تھی عمر کہ تھا قدم صبا کا
یا شعبدہ پیرِ پارسا کا

صبا یہ پھرتی ہے آوارہ اک زمانہ سے
مگر نہ نقشِ قدم کا ترے نشان ملا

واعظا جامِ مئے عشق سمجھنا نہ حرام
یہ وہ آئینہ ہے دیکھو تو حقیقت کھل جائے

بہارِ عمر کا کیا جانئے کیا فسانہ ہے
یہ شاخ بے خبری اپنا آشیانہ ہے

رخصت اے خضر کہ گم گشتگی ہے منزلِ عشق
رہنمائی کے لئے مل گیا عنقا ہم کو

اے چمن کس کا قلم مائلِ گلکاری ہے
بوٹہ بوٹہ کو جو حاصل یہ طرحداری ہے
نغمہ آرائی ہے امشب گہ دلبر ہر سمت
گویا خود عیش و طرب بر سرِ طیاری ہے
آنکھ کھولوں تو نظر خیرہ صد خواب و خیال
آنکھ موندوں تو عجب عالمِ بیداری ہے

اُف نمک ریزیِ ناصح بدلِ رنجش کہ ہائے — میں تو سمجھا تھا مرے درد کی غمخواری ہی

اُسکی شوخی ہوئی عاشق کے لئے کام روا — تیلیلے ہاتھ تھے پردہ کو اُٹھا کر مارے

جہاں پڑے تھے ہم اے رنجش رات مستِ خراب — اُسی کو حضرتِ ساقی کا آستاں کہئے

جگر بھی ساتھ گریباں کے چاک کر دینا — تمھیں قسم ہی مرا قصّہ پاک کر دینا

کیوں رنجش ہی محوِ نالہ دن رات — ہاں دیکھوں زباں تو نئے نہیں ہی

کوئی نہ باغِ دہر میں یارب ہوا نہال — ہر برگ آکے یاں کفِ افسوس مل گیا

بر لبِ رخسار سمت گیسوئے مشکین یار — جس طرح ہو پیچھے پیچھے مہر کے ابرِ سیاہ

میانِ راہ ہستی میں بسانِ کارواں بیٹھا
لگی تھی فکر منزل کی اُٹھا واں سے جہاں بیٹھا
پسندِ خاطرِ آزادہ رو کیا رسم پابندی
ٹھکانا خاص کیا میرا یہاں بیٹھا وہاں بیٹھا
سبک سر ہو کے مت چلنا کہیں اے صرصرِ دوراں
کہ اس وادی میں بھی دیوانہ ہی اک سرگراں بیٹھا
خبر اتنی نہیں آہو نہیں صحرا نہیں یاں پر
یہ باتیں کر رہا ہی رنجش تو کس سے کہاں بیٹھا
ان کے بھائی منشی جے دیال سکسینہ دورِ حاضر کے ایک مستعد شاعر اور

ادیب ہیں، ان کا کلام اور ان کے مضامین بیشتر ادیب میں شائع ہوئے اور زمانہ میں آج تک شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جے دیال سکسینہ اعلیٰ التعلیم یافتہ ہیں اور ان کے مضامین اکثر پُرمغز ہوتے ہیں، ان کے ایک مخمس کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔

کیا ہو عشق گر تو نے ترا یدل نام کر جانا — دم نظارہ جال پر کھیلنا جی سے گذر جانا
ہو مشکل امتحانِ عشق میں پورا اُتر جانا — یہ پروانہ ہو جسنے دیدہ بازی کا ہُنر جانا
اسی کا کام ہو ذوقِ نظر میں جل کے مر جانا

رواں

جگت موہن لال نام، رواں تخلص، موراواں ضلع اُناؤ کے رہنے والے
تھے۔ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے امتیازی درجہ
میں بی۔ اے پاس کیا اور ۱۹۱۴ء میں اسی کالج سے ام۔ اے، ال، بی پاس
کرکے اُناؤ میں وکالت کرنے لگے اور بہت جلد اپنے پیشہ میں نیک نام اور کامیاب
ہوئے، ان کا اخلاق، منکسر مزاجی، خوش طبعی، اور ذہانت نے دُور دور شہرت
حاصل کی، ان کے دم قدم سے ان کے وطن اُناؤ میں علم وادب کا بڑا چرچا شروع
ہوا، وہ اُناؤ میں مشاعرے منعقد کرتے تھے اور لکھنؤ و کانپور کے مشاعروں میں
ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم و مغفور سے
رواں کو بڑی عقیدت تھی۔ انھیں کی دعوت پر علی گڑھ کے مشاعروں میں دو تین
مرتبہ شریک ہوئے۔ اسی دوران میں ملنے کا اتفاق ہوا، نہایت کشیدہ قامت
نوجوان، خلق عظیم کا مُرقع، حُسن خصائل کا مجسمہ تھے۔ اپنا کلام بڑے درد اور
سوز و گداز سے پڑھتے تھے کہ سامعین پر وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی۔
ایک صحبت میں رواں نے اپنی دس بارہ رُباعیات سنائیں، مجمع کی یہ حالت
تھی کہ کسی طرح ان کے دلکش کلام سے سیری نہ ہوتی تھی، ان کے کلام کا مجموعہ
"رُوحِ رواں" کے نام سے چھپ کر ملک میں مقبول ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ رواں
عین صحت و تندرستی کی حالت میں چند روز علیل رہ کر ۱۹۳۴ء میں انتقال
فرما گئے۔ ان کی اچانک اور بے وقت موت نے عاشقانِ اردو کو سخت صدمہ پہنچایا
مرحوم اگر زندہ رہتے تو آسمانِ ادب پر آفتاب بن کر چمکتے۔

رواں کے کلام میں روانی، ترنم، فلسفہ کی آمیزش، سوز و گداز اور
رنگینی کے نمایاں اثرات جابجا موجود ہیں اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ

ان کی رُباعیات اپنی دلکشی میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو ؎

رُباعیات

اب دُشمنِ جاں ہو کُلفتِ غم ساقی
فریاد لبوں پر آگیا دم ساقی
کیا دُور نہ ہوگی یہ میری تشنہ لبی
میرے مولا میرے مکرم ساقی

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے
چلنا بیکار ہو جو منزل نہ ملے
وسطِ دریا میں غرق ہونا بہتر
اس سے کہ نظر میں آکے ساحل نہ ملے

تم تیشۂ باغباں سے کیوں مضطر ہو
شاید یہ قلم ہی نخل بارآور ہو
مقراضِ اجل ہو قاطعِ شاخِ نبات
ممکن ہو اسی میں رازِ جاں مضمر ہو

نالہ تیرا ناز سے بالا ہے
یہ رازِ افشائے راز سے بالا ہے
انساں معذورِ فکرِ انساں معذور
نغمہ آوازِ ساز سے بالا ہے

پھولوں سے تمیزِ خار پیدا کرلیں
یک رنگیِ اعتبار پیدا کرلیں
ٹھہرو چلتے ہیں سیرِ گلشن کو رِنداں
پہلے دل میں بہار پیدا کرلیں

اندازِ جفا بدل کے دیکھو تو سہی
پاؤں سے یہ پھول مل کے دیکھو تو سہی
رنگِ گلکاریِ جبینِ سجدہ
اک دن گھر سے نکل کے دیکھو تو سہی

سرمایۂ اعتبار دیدیں تم کو
رنگِ حُسنِ بہار دیدیں تم کو
اس سے بہتر کہ نت نئے شکوے ہوں
ہر جبر کا اختیار دیدیں تم کو

چھوٹوں کی بڑوں کی دستگیری دیکھوں — اپنے ہاتھ اپنی ہی اسیری دیکھوں
جب فرق نہ ہو قید میں آزادی میں — اللہ نہ کرے کہیں وہ پیری دیکھوں

عیب و حسنِ حیات کہہ دوں تم سے — جو دل کی ہو کائنات کہہ دوں تم سے
آؤ سن لو، فسانۂ دار و رسن — سو بات کی ایک بات کہہ دوں تم سے

رواں کی غزلیں دلچسپ ہیں، اُن کی تلاش و بندشیں خاص طور سے
پُرلطف ہوتی ہیں۔ مثلاً ؎

غرض رہبر سے کیا مجھ کو گلہ ہو جذبِ کامل سے
کہ جتنا بڑھ رہا ہوں ہٹ رہا ہوں دور منزل سے
سکوتِ بے محل تقریرِ بے موقع کی تہمت کیوں
اُٹھانا ہو تو یوں ہم کو اُٹھا دو اپنی محفل سے
یہ ارمانِ ترقی آج ہے دعویٰ خدائی کا
اُسی دل کا جو کل تک تھا لہو کی بوند مشکل سے
گلُ و لالہ یہ آخر کر رہا ہو غرور کیا گلچیں
یہ وہ خوں ہو جو ٹپکا تھا کبھی چشمِ عنادل سے
شبِ مہتاب، دریا کا کنارہ اور یہ سناٹا
تمھیں اس ساز پر ہم خوش کریں گے نغمۂ دل سے
غضب ہو جل کے پروانوں کا اُن کی بزم میں کہنا
رواں یا یوں فدا ہو جاؤ یا اُٹھ جاؤ محفل سے

ترے بیمارِ غم کا آج شاید وقت نازک ہے
کہ سارے چارہ جو بیٹھے خدا کو یاد کرتے ہیں

یہ حالت دیدنی ہے تیرے بیمارانِ اُلفت کی
کہ اہلِ درد چپ ہیں، چارہ گر فریاد کرتے ہیں

یوں تو اپنی ہستیِ موہوم یاد آتی نہیں
دل بھر آتا ہے مگر گورِ غریباں دیکھکر

ضعف کا تو جب مزہ ہے ایسی خیال پردئے دوست
دل سے ہم چاہیں کچھ لب لیں مگر بولا نہ جائے

ترا بجھتا ہوا دل، اور پھر دل کی ہوس کاری
مرا اس میں قصور اے دستگیرِ عاصیاں کیا تھا
لئے بیٹھے ہیں اک چاکِ جگر ہم یادگار اُس کی
نہ پوچھو ہم سے اُس سفاک کا نام و نشاں کیا تھا
کسی برقِ تجلی پر ذرا سا غور کر لینا
اگر یہ جانتا ہو عالمِ روح تردد ابن کیا تھا

دل ہو آزاد تو ہے قید بھی سامانِ نشاط
ہو گیا سازِ طرب نغمۂ زنجیر مجھے
بوئے خوں آتی ہے ہر گوشۂ گلشن سے کہ اں
مقتلِ حسن ہے یہ خاک کی تعمیر مجھے

طبیعت کی جودت اور زبان کی تاثیر سے لطف اندوز ہوں گے

شاعری

مرحبا، مشاطۂ زلفِ مضامینِ بلند
رہبرِ راہِ خدا ہادیِ جانِ دردمند
رازدارِ ضبطِ دل اے پردہ دارِ رازِ نفس
کاشفِ اسرارِ باطن عکسِ سوز و سازِ نفس
اے بہارِ بے خزاں اے آفتابِ لازوال
کر نہیں سکتا تجھے ہے زمانہ پائمال
اے نشانِ رفتگاں اے رنگِ خونابِ جگر
نورِ قلبِ باصفا تعبیرِ جذبِ پُراثر

جسپہ سو جہاں سے ہو دل جس پہ ترا وہ ناز ہو
جس نے عالم کو کیا بسمل ترا انداز ہو

اے انیسِ گوشۂ عزلت گزینانِ الم
اے شریکِ حالِ زارِ صاحبانِ دردِ غم

اے زبانِ غیب اے بچے کی سچی ترجماں
نیّرِ افلاکِ شہرت یادگارِ جاوداں

کب تری معراج کے ہمسر ہے معراجِ شہی
تیرے قدموں پہ نچھاور سیکڑوں تاجِ شہی

لاوارث بچہ

عرف

غنچۂ ناشگفتہ

آہ اے نو واردِ بزمِ پُر آزارِ روزگار
آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار

آہ اے دیباچۂ شرحِ کتابِ دردِ دل
آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جانگسل

آہ اے تعبیرِ خوابِ بستِ ایامِ شباب
آہ اے تفسیرِ کیفِ بادۂ جامِ شباب

آہ اے زنجیرِ پائے نازکِ وہم و گماں
آہ اے تصویرِ احساسات و جذباتِ نہاں

سچ بتا مجھے ترا وارث ترا والی ہے کون
پھول ہے تو کس چمن کا اور ترا مالی ہے کون

زینتِ آغوش ہے تو جس کی وہ مادر ہے کون
نور ہے جس گھر کا تو مجھے بتا وہ گھر ہے کون

اختصارِ طولِ آزارِ نہانی سچ بتا
اے خمارِ بادۂ جوشِ جوانی سچ بتا

کیا اڑا لائی کسی گلزار سے تجھ کو ہوا
پھول کھلتے ہیں جہاں ایسے ہی پیدا خوشنما

یا عناصر میں ہوئی ترتیب پیدا اسقدر
خود مرکب ہو گئے اور بن گئے شکلِ بشر

تو کوئی اسرارِ پنہانی کا دفتر تو نہیں
تو کسی میخانۂ معنیٰ کا ساغر تو نہیں

آہ یہ تیری ادا حسنِ تحیر زا ترا
روکشِ لطفِ تبسم آہ یہ رونا ترا

یوں نہ کرتی ورنہ مال اپنا فشارِ آرزو
حسن کا برباد ہو جانا ہمیں بھاتا نہیں

یوں بناتی خود نہ مال اپنا مزارِ آرزو
میرے مولا یہ سمجھ میں راز کچھ آتا نہیں

"پپیہا"

وہی تان پھر سنا دے مرے خوشنوا پپیہے
مرے دلربا پپیہے مرے خوشنوا پپیہے

اُسی دردمند دل سے اُسی صوتِ مضمحل سے
ترے عشق کے تصدق وہی راگ گا پپیہے

مری نیند اُچٹ گئی ہے تری صوتِ جانفزا سے
دلِ مضطرب ہے بے کل اسے تو سلا پپیہے

یہ گھٹائیں کالی کالی یہ ہوا کے سرد جھونکے
کوئی تان اونچے سُر میں ذرا پھر لگا پپیہے

یہ دھرا ہے نسخۂ دل یہ کھلا ہے بابِ حدت
جسے پھر کبھی نہ بھولوں وہ سبق سکھا پپیہے

ترا صبر اور توکل ترا ضبط اور قناعت
تجھے آفریں پپیہے، تجھے مرحبا پپیہے

یہ غضب کی آہ و زاری یہ بلا کی بیقراری
تجھے کس کا ہے تصور ہمیں کچھ بتا پپیہے

عصر حاضر
کے
ہندو شعراء

ساحر

پنڈت امرناتھ نام، ساحر تخلص، آپ رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن رئیس دہلی کے خلف اکبر ہیں۔ آپ بمقام دہلی ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے، بارہ برس کی عمر میں پنڈت پرشاد رام راز داں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور تین چار ہی سال میں اردو فارسی کے ماہر ہو گئے اور مولانا عبد الحلیم عاصم کاشانی سے فارسی میں تلمذ اختیار کیا۔ شفیق استاد کی توجہ سے چند ہی روز میں علم عروض قوافی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت پیدا کر لی اور عمدہ شعر کہنے لگے، کچھ دنوں تک سرکاری عہدہ کے ذمہ داریوں کی وجہ سے شعر و شاعری کی گرم بازاری کم ہو گئی، . . . . ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد شاعری کی گرم بازاری شروع ہو گئی، جس طرح آپ میدانِ نظم کے علمبردار ہیں اسی طرح نثر میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ ۱۹۰۸ء میں "سحر ساحر" میں آپ کے بلند پایہ مقالے شائع ہوئے۔ آپ متعدد کتب کے مترجم مؤلف اور مصنف ہیں جہاں آپنے اردو میں بھگوت گیتا کے خلاصہ کو نظم کیا، نیشن رایوں کا ترجمہ کیا ہے وہاں شعرائے انگلستان کے زریں خیالات کو بھی اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال دیا ہے، آپ قصیدہ، رباعی، قطعہ مخمس، مسدس، غرض جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہیں۔ بندش کی خوبی مضامین کی خوش اسلوبی قابل داد ہے۔ زبان نہایت صاف ہے، آپ خط و خال، شاہد و ساغر کے پیرایہ میں جو عارفانہ خیالات ادا کرتے ہیں وہ صاحبانِ ذوق پر وجد کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:

حوصلہ وجہ تپش ہائے دل و جاں نہ ہوا　　شعلۂ شمع تری بزم میں رقصاں نہ ہوا

حسن تھا مستِ ازل جامۂ لیلیٰ سے　　تن کی عریانی سے مجنوں کو بھی عریاں نہ ہوا

لبِ منصورؒ سے دی کس نے انا الحق کی صدا　　تو اگر پردۂ پندار میں پنہاں نہ ہوا

ہم رہے چشمِ عنایت سے ہمیشہ محروم
دل نشیں تیرِ نظر کا کوئی پیکاں نہ ہوا

چشمِ جاناں میں سماتے ہیں سمانے والے
موت سے آنکھ لڑانا کوئی آساں نہ ہوا

دل ہو بتخانۂ اصنامِ خیالی ساحر
تو وہ کافر ہو کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

سرِ عرشِ بریں ہو زیرِ پائے پیرِ میخانہ
کمالِ اوج پر ہو حسنِ عالمگیرِ میخانہ

زیارت کو چلے ہیں شیخ و زاہد فی امان اللہ
خدا کی شان ہو کچھ پھر گئی تقدیرِ میخانہ

پری شیشہ میں ہو ساغر میں ہو خورشید نور افگن
یہ ہے تسخیرِ میخانہ، وہ ہو تنویرِ میخانہ

جو پہنچا میکدے میں چھوڑ کر دیر و حرم ساحر
[illegible] سرِ ذوقِ مستی میں رہے تاثیرِ میخانہ

آئی جو مجھ کو نیند تصور میں ایک بار
کیا دیکھتا ہوں سامنے تصویرِ یار ہے

میں نے بصد سماجت و منت کہا کہ یار
کیوں میرے پاس آنے سے تجھ کو عار ہے

سامانِ جملہ عیش مہیا تو ہیں سبھی
تیرے بغیر سینے میں دل بیقرار ہے

آبِ رواں ہے کشتیِ مے اور جامِ زر
سبزہ ہے، گل ہے، ابر ہے، جوشِ بہار ہے

موجِ طرب ہے جوشِ طبیعت ہے رنگِ شفق
سب کچھ ہے، ایک صرف ترا انتظار ہے

یوں دُر فشاں ہوئے لبِ نازک کہ ماہ جبیں
سن میرے قول کا تجھے گر اعتبار ہے

ہے منزلِ فنا میں مرا ہمسفر وہ داغ
روشن چراغِ گنبدِ مینا کہیں جسے

سینہ چمن ہے غنچۂ دل ہے شگفتہ دل
تیری نگاہ ہو چمن آرا کہیں جسے

غم پروریدہ ہے دلِ شوریدگانِ عشق
فرقت کی ایک رات ہے دنیا کہیں جسے

منسوب کفر دیر سے ایماں حرم سے ہے
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

وہ تیرہ بخت ہوں مرے ظلمت کدہ کا نور
ہے روشنائی شبِ یلدا کہیں جسے

ساحر نفس وہ دام ہے جسمیں کہ ہے اسیر
معراجِ رمِ خیال کہ عنقا کہیں جسے

تو ہے اور تجھے بے وفائی ہے
میں ہوں اور رنگِ آشنائی ہے

آئینہ سے نگاہ جو دوچار ہوگئی
شبنم لطافتِ گلِ رخسار ہوگئی

عالم مٹا ہوا ترے نقشِ قدم سے ہے
نقشِ قضا مگر تری رفتار ہوگئی

دل مٹا پر نہ مٹا حرفِ محبت دل سے
کفر اسلام ہوا مرکزِ ایماں نہ ہوا

ریش ہو دل جو مئے عشق سے سرشار نہ ہو
سر قلم ہو جو سزاوارِ سرِ دار نہ ہو

حسن کیا حسن ہے جلوہ جسے درکار نہ ہو
یوسفی کیا ہے جو ہنگامۂ بازار نہ ہو

ہم ہیں اور بیخودی و بیخبری
اب نہ رندی نہ پارسائی ہے

لے لوٹ ہو دامانِ نظر رنگِ اثر سے
ہے خار بھی گل مجھ کو مساواتِ نظر سے

زندگی میں ہے موت کا نقشہ
جس کو ہم انتظار کہتے ہیں

اے یہی رُو ترے دیوانے کا ایماں کیا ہے
اک نگاہِ غلط انداز پہ قرباں ہو

پنہاں نظر سے پردۂ دل میں ہے وہ شوخ
کیا انتہا نہ ہو مجھے ہجر و وصال کا

بزم میں شمع بھی ہو آپ بھی ہیں شب افروز دیکھنا یہ ہو کہ پروانے کدھر جاتے ہیں

ساحر دہلوی کی وہ غزل درج ذیل ہو جو انھوں نے کل ہند اردو کانفرنس منعقدہ دہلی ۱۹۳۹ء میں پڑھی تھی ؎

تری اے نورِ وحدت جلوہ سامانی نہیں جاتی
شہود تن میں نورِ جاں کی عریانی نہیں جاتی

ہر اک پروانہ روشن شمع پر جاں اپنی دیتا ہو
ضمیر عاشقاں سے رسم قربانی نہیں جاتی

نفس کے تزکیہ سے علم کی اک شمع روشن ہو
کثافت سے خودی کی دل کی نادانی نہیں جاتی

ظلماتِ جہانِ آرزو میں ہے جو آشفتہ
کسی صورت سے اس دل کی پریشانی نہیں جاتی

موحّد کوئی ہو سکتا نہیں جب تک کہ اے ساحر
نگاہِ حق نہ باطل باقی وحدانی نہیں جاتی

کل ہند اردو کانفرنس کے مشاعرہ میں دوسری طرح بھی تھی، اسمیں بھی حضرت ساحر نے طبع آزمائی کی ہو۔ ملاحظہ ہو ؎

شانِ کمال حسن عیاں انجمن میں ہو — حسنِ خیال حسنِ ادا ہر سخن میں ہو
فرزانہ عشق پردہ بر انداز اِے حسن — دیوانہ دل کہ زلف شکن در شکن میں ہو
تاباں ہو نورِ ذات سے کل کائنات حسن — پرتو ہو نورِ جاں کا جو احساس تن میں ہو
سینہ میں دل ہو نقطۂ پرکار عافیت — ہر دم نفس سفر میں بھی رہ کر وطن میں ہو

ساحر عطائے رحمت باری ہو کفرِ عشق
رندوں کو شمع طور یہ دیر کہن میں ہو

ساحر کے کلام میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے نگار شعور کی دو قسمیں

یوں رائے زنی کی ہے۔

"شاعر کہنہ مشق ہیں لیکن کوئی خاص رنگ نہیں، خیالات بھی

ناہموار ہیں۔"

مگر پروفیسر مجنوں گورکھپوری مندرجہ ذیل خیال رکھتے ہیں۔

"وہ متصوفانہ غزل گوئی کے روائتی تصور کے نمائندے ہیں"

پروفیسر آل احمدؔ صاحب سرورؔ کا خیال ایک حد تک پروفیسر کلیم سے ملتا جلتا

ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"شاعری پر اُنھوں نے کوئی اثر نہیں چھوڑا، زمانہ اُنھیں

جلد بھول جائے گا۔"

شوقؔ

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ نام، شوقؔ تخلص، آپ کے والد ماجد کا نام پنڈت وشیشور ناتھ رینہ تھا، شوقؔ ۱۸۶۳ء میں بمقام اندور پیدا ہوئے آپ کا آبائی تعلق ریاست جاورہ سے تھا۔ نواب غفور خاں مہاراجہ ہلکر کے سپہ سالار تھے۔ ان کو علیحدہ علاقہ دیا گیا تھا۔ شوقؔ کے جد امجد کو نواب غفور خاں نے ریاست جاورہ کا دیوان مقرر کیا تھا۔ پنڈت جگموہن صاحب تلاش معاش میں جاورہ سے شمالی ہندوستان آگئے اور ۱۸۹۰ء میں غیر مستقل طور پر ڈپٹی کلکٹر مقرر کئے گئے۔ آپنے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے تیرہ ضلعوں میں ڈپٹی کلکٹری کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۰ء پنشن لی اور آجکل شاہجہاں پور میں مقیم ہیں۔

دنیائے شعر و شاعری میں آپ کو ابتدا ہی سے منشی امیر احمد مینائی جیسا اُستاد کامل ہاتھ آگیا تھا۔ مگر ۱۸۸۴ء سے ۱۹۲۰ء تک کا کلام ضائع ہوگیا۔ پھر ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۵ء تک، ڈپٹی کلکٹری کے فرائض کی انجام دہی سے آپ کو بالکل فرصت نہیں ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں سید محمدؐ نوح صاحب شہیر مچھلی شہری کے شاگرد ہوئے۔ اب کبھی تاباں بدایونی سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔

شوقؔ کا کلام کنگھی، چوٹی، انگیا اور مسّی کے سوقیانہ مضامین سے پاک ہو آپ کے یہاں عیاشانہ شاعری کا قطعاً ذکر نہیں ہو۔ عامیانہ خیال سے گریز کی ہو۔ بازاری الفاظ اور محاورے بھول کر بھی نظم نہیں کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے کرخت اور سنگین الفاظ کو بھی جگہ نہیں دی آپ کے مجموعۂ کلام "پیام شوق" کو دیکھ کر یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ آپنے رفتہ رفتہ اپنی غزلوں میں کیا ترقی کی ہو کیونکہ سب سنہ کے حساب سے درج ہیں، یہاں پہ ان کا نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہو۔

۱۹۱۶ء

ستا کر ستم کش کو کیا پائیے گا — جو کی کچھ شکایت تو جھنجھلائیے گا
وہ برقِ تجلی کی ہے جلوہ گاہ — وہیں حضرتِ دل نہ رہ جائیے گا
ادب کی جگہ مرنے والوں کی قبر — سمجھ کر یہاں پاؤں پھیلائیے گا
غریب اب تو قدموں میں ہے آ پڑا — دلِ ناتواں کو نہ ٹھکرائیے گا

خبر بھی ہے کچھ بارِ عصیاں کی شوق
ہوئی واں جو پرسش تو شرمائیے گا

۱۹۲۰ء

پڑا نہ آنکھ کو ساقی کہ بادہ نوش ہوں میں — ابھی تو فیصلہ ہوتا ہے ایک ساغر پہ
مریضِ عشق کی حالت کبھی نہ سنبھلے گی — مجھے تو چھوڑ دے اے چارہ گر مقدر پہ
ہمارے نالے بھی تھک تھک کے اب تو بیٹھ رہے — گئے وہ دن کہ اٹھاتے تھے آسماں سر پہ
ہمارے میکدہ کو چھوڑ کر نہ جا زاہد — ملے گا قطرہ نہ کمبخت حوضِ کوثر پہ

گلہ نہ ہم نے کیا شوق اُس ستم گر سے
بلائیں سب وہ اُٹھائیں جو آ پڑیں سر پہ

۱۹۳۶ء

مے کا یہ احترام ارے توبہ — اور پھر وہ حرام ارے توبہ
دل کو سرمست کر ہی دیتی ہے — یادِ ساقی و جام ارے توبہ
اللہ اللہ کر ارے زاہد — جامِ مے صبح و شام ارے توبہ
بت پرستی میں جس کی عمر کٹی — ایسے کافر کا نام ارے توبہ
ایک بے جاں کے قتل کرنے کو — اس قدر اہتمام ارے توبہ
غمزدوں کی یہ خامشی ہے غضب — صبر کا انتقام ارے توبہ

آج پھر لے سے لے لیا کس نے
شوقِ رسوا کا نام ارے توبہ

١٩٣٩ء

عشق کا راز نہ کیوں دل سے نمایاں ہو جائے
کاش یہ بھی کسی ناکام کا ارماں ہو جائے

نہیں اُمید کہ وہ حشر بداماں ہو جائے
ایسا دیوانہ جو خود داخلِ زنداں ہو جائے

درد قابو کا نہیں کاش وہ اُٹھ کر شبِ غم
سرگذشتِ دلِ ناشاد کا عنواں ہو جائے

نہ تسلی نہ دلاسا، نہ کہیں نام کو صبر
حیف اُس دل پہ کہ یوں بے سروساماں ہو جائے

غنچے چٹکیں کہ کھلیں پھول بڑھے جوشِ نمو
حُسنِ پنہاں کسی عنواں سے نمایاں ہو جائے

ہو یہ وحشت کا اثر خندۂ گل سے ظاہر
پھول جب کھلنے لگیں چاک گریباں ہو جائے

چشمِ تر نالۂ دل سوز دروں دردِ فراق
ایک مہجور کو کیا کیا سروساماں ہو جائے

شوق سے نوش کر اتنا بھی گوارا نہ ہوا
خُم میں جو دُرد بچے نذرِ حریفاں ہو جائے

غزل نوروز

دلکش سُتھرا کلام نوروز
لو آؤ سنو پیام نوروز

ملتا ہر دم ہے لطف تازہ
کیسا پیارا ہے نام نوروز

سارا گلشن ہے رشکِ رضواں
کیا خوب ہے فیضِ عام نوروز

آ بیٹھی چہکنے شاخِ گل پر
بلبل نے سنا جو نام نوروز

ساغر کو سنبھالے رہنا اے شوق
لغزش ہے لیے خرام نوروز

ہلچل سی مچی ہے اک جہاں میں
کیا جانے ہے کیا نظام نوروز

ناچیز اگرچہ ہے بظاہر
تحفہ ہے مرا سلام نوروز

اے شوق یہاں ہیں ہم بھی مجبور
دُنیا میں نہیں قیام نوروز

کیفی

پنڈت برج موہن دتاتریہ نام، کیفی تخلص۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں ہوئی جہاں فارسی اور اردو کی درسی کتابیں بہت جلد پڑھ لیں۔ انگریزی کی تعلیم سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں ہوئی۔ یورپ کے سفر کا بھی موقع ملا، وہاں کے طور طریقے خیالات اور حالات جاننے کا موقع ملا، مولانا حالی اور حضرت آزاد کی صحبتیں اٹھائے ہوئے ہیں، مدتوں ریاست کشمیر میں عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے، اب انجمن ترقی اردو کے رکن خاص ہیں اور انھیں مشاغل میں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔ نہایت سنجیدہ، متین بزرگ ہیں، اردو فارسی سے عشق ہے جو خاندانی ورثہ کی حیثیت سے ان تک پہنچا ہے اور جس کو وہ مال سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، آپ کو بحیثیت محقق زبان نثار اور ناظم کے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ دور حاضرہ کے ایک مشہور و معروف شاعر ہیں، آپکی رنگین بیانی نے دنیائے ادب اردو سے خراج تحسین حاصل کیا ہے اور ادیب، العصر، مخزن، زمانہ میں ان کی نظمیں بہت کثرت سے شائع ہوکر مقبول عام ہوئی، اچھے اچھے سخن سنج ان کے کلام کی دل سے قدر و منزلت کرتے ہیں اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کا کلام منتخب یہ ہے۔

خیر مقدم گرامی

کیا سلف میں خوبیاں ہونگی کہ نہاں ہو گئیں — صفحۂ تاریخ پر ہاں کچھ نمایاں ہو گئیں

بھول کر بھی اب نہیں آتی کسی کو ان کی یاد — سب وہ اگلی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں

وہ فضائل اب کہاں ہیں ہند کی تہذیب میں — جن پہ شرق و غرب کی اقوام قرباں ہو گئیں

چرخ کج رفتار کیا طبقہ دیا تو نے الٹ — تیری چالیں گردش چشم حسیناں ہو گئیں

برکتیں ہم تک جو پہنچیں فتنہ ساماں ہو گئیں　　روشنی نے غرب کی سر ا د ر خیرہ کر دیا

باغ دل

طلب سچی خوشی کی ہو تو اس گلزار میں آ کر
رگِ گل میں تو موجِ بحرِ عرفاں کا تماشا کر
یہ باغ دل ہو اس میں ہو عمل عشق حقیقی کا
نظارہ اس کا جب ہو پہلے حاصل چشم بینا کر
مٹا ہو گر کسی صورت پہ تصویر اُس کی بن جا تو
اگر محوِ خودی ہو آپ کو ہر شے میں دیکھا کر
پھنسا ہو دل کسی بت کے اگر گیسوئے پرخم میں
تو سنبل میں کبھی زلفِ یار کی لپٹوں کو سونگھا کر
سما جا اسمیں جا کر تو جو تجھ میں قابلیت ہے
تغافل کا نگاہِ یار کی ہرگز نہ شکوا کر
نہیں گر تاب ہجراں کی تو خواہش وصل کی مت کر
جو ہاتھ آ کر نکل جائے کبھی اس کا نہ پیچھا کر
انانیت نہ ہو تجھ میں تو کیا دھڑکا رقیبوں کا
جو ہے منظور یار اپنا ہو تو غیروں کو اپنا کر
یہ کہد یا تو ہو اک بات میں تو دو نہیں ذاتیں
تصور اور عمل میں اپنے تو یہ رنگ پیدا کر

تمیزِ زلف و عارض خال و ابرو کچھ نہیں رہتی
فروغِ حسن کی تاثیر و طاقت ایسی ہوتی ہے
نظر آتا ہو نورِ روئے جاناں اُس کو ہر شے میں
نگاہِ محوِ نظارہ کی حیرت ایسی ہوتی ہے

رقابت اور غیریت کا بوجھ اُس سے نہیں اُٹھتا
خیالِ حُسنِ جاناں کی نزاکت ایسی ہوتی ہے

خبر رکھتے ہیں کل کی آپ سے وہ بیخبر ہو کر
مئے عرفان کی مستوں کی غفلت ایسی ہوتی ہے

نہ دل ہو طالبِ وصل اور نہ شوقِ دید آنکھوں کو
اسی کو عشق کہتے ہیں، محبت ایسی ہوتی ہے

اگر اس باغِ دل کا تو کبھی محوِ تماشا ہو
تو علمِ ذات حاصل کرکے خود اپنے پہ شیدا ہو

وسعت آرائی دلتنگیٔ حسرت مت پوچھ — دم جو نکلا تو میں اپنا اسے ارماں سمجھا
حال یہ بیخودیٔ عشق میں کیفی کا ہوا — شیخ کا فر اسے اور گبر مسلماں سمجھا

آباد ہے یہ خانۂ دل اک خیال سے — دُنیا کے حادثے اسے ویراں نہ کر سکے
ان میں جو تھا نہاں وہی مرکزِ دل رہا — جلوے مری نظر کو پریشاں نہ کر سکے

کیفی صاحب نے ۱۹۳۹ء میں ایک نظم خیر مقدم شرکائے اردو کانفرنس پڑھی تھی جو درج ذیل ہے ؂

ہیں تو مشہور جہاں جشنِ شہانِ دہلی — زیبِ تاریخ بہت کچھ ہے بیانِ دہلی
آج اس اجلاس سے ہے اور ہی شانِ دہلی — شہر دہلی میں ہے کچھ ذکرِ زبانِ دہلی

ایک دہلی نہیں کل ہند کی جاگیر ہے یہ
دامنِ اردو کا فراخ اور جہانگیر ہے یہ

دور و نزدیک سے احباب چلے آتے ہیں — ساتھ وہ خدمتِ اُردو کی لگن لاتے ہیں
مئے اُلفت سے جو سرشار انھیں پاتے ہیں — میزباں آنکھیں بچھاتے ہیں بچھے جاتے ہیں
آئیے آپکو سر آنکھوں پہ ہم بٹھلائیں — بس گھڑی ہی ہے یہ کہ آپ آئیں کرم فرمائیں

آپ حضرات کا دوروں سے یہاں آج آنا   دعوتِ حق پہ یہ لبیک زباں پہ لانا

حالِ اردو پہ توجہ کی نظر فرمانا   انجمن نے اسے احساں بہ دل سے مانا

آپ کے پائے مبارک پہ جو ہو گردِ سفر

چشمِ اخلاص و محبت کو ہو وہ نورِ نظر

ہو زباں کیا یہی کچھ دل کے سنانے کے لئے   اور خیالات کی دنیا کو سجانے کے لئے

عمل و علم کو اک راہ پہ لانے کے لئے   راستہ رفق و مدارا کا بتانے کے لئے

اس صفت سے جو مزین ہو زبانِ اردو

مرجعِ شیخ و برہمن ہو زبانِ اردو

غیرِ اردو نے کسی کو بھی نہ ہرگز جانا   زیبِ تن اس نے کیا جس کو جو بھایا پایا

سیکھتا اس سے کوئی چیز ہو کیا اپنانا   آلۂ کار اسے سب نے برابر مانا

سندھیا اس میں ہوئی اس میں مناجات ہوئی

دین اور دھرم کی اردو سے مدارات ہوئی

امتیاز اس کو ذرا انسان سے انساں میں نہیں   حسد و رشک کا خار اس کے گلستاں میں نہیں

فرق اس کے لئے گبر اور مسلماں میں نہیں   اس کو تمیز ذرا وید میں قرآں میں نہیں

شرک میں اس کے یہ وحدت سے جلا پائی ہو

جس پہ یکتائی خدا ہو یہ وہ ہرجائی ہو

آئیے ہم کریں مل جل کے سب اسکی خدمت   کیونکہ ہو اسکی بڑائی میں وطن کی عظمت

ہو گی اردو سے روا اہلِ وطن کی حاجت   پائے گا قوم کا جسم اس سے ہی کامل صحت

کیونکہ اصل اسکی موالات نہ غداری ہو

اس کی گھٹی میں محبت ہو وفاداری ہو

کل ہند اردو کانفرنس کے مشاعروں میں انھوں نے جو غزلیں پڑھیں وہ بھی درج ذیل ہیں۔

صبحِ وطن بھی شامِ غریباں سے کم نہیں   اختر ہمارے بخت کا کب سے گہن میں ہو

سنبرے کو سنتے آئے تھے بیگانۂ چمن | بیگانگی یہاں تو گل و یاسمن میں ہے
وہ میکدہ وہ بادہ وہ ساقی نہیں رہا | لیکن یہ بزم ہے کہ خمار کہن میں ہے
ان و ہمی قصوں اور غلو میں بھلا کہاں | تاثیر وہ کلام کے جو سادہ پن میں ہے

خالق کی طاعت اصل میں خدمت ہے خلق کی
پیارے خدا کا عشق کو حب وطن میں ہے

فروغ جلوہ کی ہنگامہ سامانی نہیں جاتی
وہ صورت روبرو ہو کر بھی پہچانی نہیں جاتی
وہ کچھ آئینہ میں دیکھا کہ ہیں تصویر سے گم سم
بنے بیٹھے ہیں وہ بت ان کی حیرانی نہیں جاتی
حوادث کچھ ہوں تر دامن نہ ہوگا پاک طینت کا
کہ شبنم سے گلوں کی پاک دامانی نہیں جاتی
حقیقت میں یہ کڑیاں جھیلنے کا وقت ہے، لیکن
عزیزو دل کی وہ غفلت وہ تن آسانی نہیں جاتی
ہو جذبات و حقائق کا تو کیونکر شعر آئینہ
سخن سنجوں کی وہ طرزِ غزل خوانی نہیں جاتی

پروفیسر کلیم الدین احمد نے کیفی کی غزل گوئی پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔
"کیفی کے اشعار خشک ہیں، اور ان میں بیرنگی اور نثریت بھی ہے، یہ کبھی از خود رفتہ نہیں ہو جاتے۔ ہمیشہ اپنے دامن کو سنبھالے ہوئے رہتے ہیں اور کبھی اس لغزش پا کے مرتکب نہیں ہوتے جس پر سیکڑوں دل ہوشیاریاں قربان ہیں۔ کبھی کبھی ایسے اشعار بھی قلم سے نکل جاتے ہیں۔۔۔"

اک خواب کا خیال ہے دنیا کہیں جسے | ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے

خمیازہ ہے کرشمہ پرستی دیر کا　　اہلِ زمانہ عالمِ عقبیٰ کہیں جسے

پروفیسر آلِ احمد صاحب سرور رقم طراز ہیں ؎

"کیفی شیخ و برہمن سے چھیڑ چھاڑ کرتے جاتے ہیں مگران کا کلام پھیکا اور بے لطف ہے، کیفی نے شاعری پر کوئی اثر نہیں چھوڑا زمانہ انھیں اس حیثیت سے بہت جلد بھلا دے گا، وہ اگر یاد رہیں تو اپنے فن اور اپنی اُستادی کی وجہ سے"۔

پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے:۔

"ان کے کلام میں کیفیت کا غلبہ نہیں ملتا جو شاعری کی اصل روح ہے"

ناشاد

رام پرشاد کھوسلہ نام، ناشاد تخلص، ان کے والد کا نام رائے بہادر سالک کھوسلہ تھا، ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ضلع جالندھر کے ایک قصبہ داہن میں ان کا وطن ہے، ۱۹۰۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ام، اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی، اے آنرز کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء میں سناتن دھرم کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں آئی، ای، ایس میں چن لیے گئے اور کٹک مظفرپور بھاگلپور اور پٹنہ میں مختلف کالجوں میں پرنسپل رہے، کئی مرتبہ یورپ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتے ہوئے انگلستان جا چکے ہیں، اردو زبان کے ایک پختہ کار مشاق اور رنگین نوا شاعر ہیں، غزلیں بھی کہتے ہیں، لیکن زیادہ توجہ نظموں پر ہے، اردو کے چوٹی کے رسالوں میں ان کا کلام بڑی قدر و منزلت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ یہ عزت زیادہ تر زمانہ کو حاصل ہوتی رہتی ہے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔ ناشاد ۱۲ جون ۱۹۴۲ء کو سرگباسی ہوئے۔

کبکِ دری

اے مرے کبکِ دری کیا ناز سے چلتا ہے تو
واہ وا کیا رقص کے انداز سے چلتا ہے تو

تیرے ہر ہر گام پر سو سو نزاکت ہے فدا
بانکپن میں تو ہر اک مرغِ چمن سے ہے جدا

بزمِ مرغانِ چمن سے کیوں الگ رہتا ہے تو
کنجِ تنہائی میں کیوں رنج و الم سہتا ہے تو

کوہساروں میں پڑا کیوں ٹھوکریں کھاتا ہے تو
کس لیے خاموش صحراؤں میں منڈلاتا ہے تو

ماہِ تاباں کی جھلک نے تجھ کو بےخود کر دیا
بادۂ رنگیں نے تیرا ساغرِ دل بھر دیا

آتشِ قلبِ حزیں کو خوب بھڑکاتا ہے تو
جب نظر آئے تو انگارے نگل جاتا ہے تو

ہاں بتا دے کشتۂ نازِ عروسِ آسماں
صحنِ گلشن میں بناتا کیوں نہیں تو آشیاں

کیوں الگ رہتا ہے تو احبابِ بزمِ دہر سے
خوف آتا ہے تجھے کیا باغباں کے قہر سے

بیکسی ناشاد کی تو آنکھ بھر کے دیکھ لے
بستیِ وادی پہاڑوں سے اُتر کر دیکھ لے

اُجڑا چمن

مرے دل کے اُجڑے چمن میں آئی عجیب طرح کی بہار ہے
کہیں داغِ دل ہیں کھلے ہوئے کہیں مرغِ دل کی پکار ہے

مرا سوکھے تنکوں کا آشیاں، نہ اُجاڑ باغ سے باغباں
کہ جسے سمجھتا ہے تو خزاں وہ مرے چمن کی بہار ہے

نہیں کیفِ بادۂ زندگی نہ پئے اِسے نہ پئے کوئی
نہ خوشی ہے اس میں نہ بیخودی نہ سرور ہے نہ خمار ہے

نہیں پھونکتی ہیں بساطِ قلب کو آسماں کی بجلیاں
مرے رختِ دل میں شرر فشاں مری آرزو کا شرار ہے

ہیں کڑی حیات کی منزلیں، نظر آتی راہِ بقا نہیں
جسے لوگ کہتے ہیں زندگی وہ بشر کے دوش پہ بار ہے

وہی شامِ بخت کی تیرگی وہی نغمہائے غم و الم
وہی انجمن وہی مطرب اور وہی سازِ قلب کا تار ہے

وہی انتظار سحر کا ہے، وہی راہ دیکھنا شام کی
وہی آسماں کی گردشیں، وہی دورِ لیل و نہار ہے

یہ جہاں ہے ایک الم کدہ، نہ بچا ہے کوئی بھی دل یہاں
کہیں آرزوئیں شہید ہیں، کہیں حسرتوں کا مزار ہے

کنج تنہائی

نہیں محروم سامانِ طرب سے اپنی ویرانی
گدائی میں بھی اس در کی ہے پنہاں شانِ سلطانی

بلا جانے تری اے محتسب معلوم کیا تجھ کو
نہاں ہیں دلقِ درویشی میں کتنے لعلِ رمانی

جنھیں ہے عشق صادق جن کو ذوقِ دردِ اُلفت ہے
کرے کیا مضطرب ان کو شبِ ہجراں کی طولانی

اگر ہے وصل کا ارماں تجھے اے ناصحِ ناداں
تو ہو وقفِ تمنا شوق میں کر دل کی قربانی

بتا زاہد ملا جمعیتِ خاطر سے کیا تجھ کو
مجھے عرشِ بریں تک لے گئی میری پریشانی

نہ طاقت ضبط کی دل کو نہ چارہ مجھ کو درماں کا
کہوں کیا تجھ سے اے ناصح میں حالِ دردِ پنہانی

ابھی کون و مکاں کا راز کھل جائے گا اے زاہد
اگر گوشہ نشینی چھوڑ کر ہو محوِ دربانی

مرے دل کی ہے قیمت اک نگاہِ نازِ جانانہ
تعجب ہے مجھے جنسِ گراں کی دیکھ ارزانی

جو دُنیا میں رموزِ عشقِ صادق سے ہیں نامحرم
نہیں معلوم ان کو شیوہ ہائے اشک افشانی

جو سچ پوچھو تو اے زاہد نہیں بہتر زمانے میں
تری عُریانیِ تن سے کسی کی پاک دامانی

کبھی تر دامنی کا اُس پہ دھبّہ آ نہیں سکتا
ترے خرقہ سے اے زاہد ہے بہتر میری عُریانی
وہی اللہ کا گھر ہو، جہاں سب کو پہنچنا ہے
کہاں کا کفر اے ناآشنا اور کیسی مسلمانی

صحرا

یہ دورِ بیابانی، یہ عالمِ صحرائی
تنہائی و خاموشی خاموشی و تنہائی

سورج کی شعاعوں کی بے کیف فضاؤں کی
خاموش فضاؤں کی یہ انجمن آرائی

ہر سمت نظر آئے اک وسعتِ بے پایاں
آوارہ میں پھرتا ہوں دیوانہ و سودائی

روکے نہ کوئی مجھ کو تھامے نہ کوئی مجھ کو
میں شوق میں بن جاؤں اک آہوئے صحرائی

اک رقص بگولے کا رفتار سے پیدا ہو
وہ دشت نوردی ہو وہ بادیہ پیمائی

تا حدِ نگہ میری پرواز تخیّل ہو
گوشے میں نظر آئے افلاک کی پہنائی

عالم سے گریزاں ہوں میں چاک گریباں ہوں
پھرتا ہوں سراسیمہ وحشت کا تماشائی

صحرا کا ہر اک ذرّہ محرم ہو مرے دل کا
ہر خارِ مغیلاں کو مجھ سے ہو شناسائی

جوشؔ

پنڈت لبھو رام نام، جوشؔ تخلص، یکم فروری ۱۸۸۲ء بمقام ملسیان ضلع جالندھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں حضرت داغؔ مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا، اور ڈھائی تین سال تک یہ سلسلۂ اصلاح جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء میں استاد داغؔ کی وفات کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہ لی، اپنے ہی ذوقِ سلیم پر بھروسہ کیا۔ مختلف سرکاری ہائی اسکولوں میں اوّل مدرس فارسی رہ کر ۱۹۳۸ء کے شروع میں ملازمت سے پنشن پائی۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان میں صوبہ بھر میں اوّل رہے۔ لاہور، دہلی، شملہ کے آل انڈیا مشاعروں میں شریک ہوتے رہے، اور ہر جگہ خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ ان کے کلام کا ایک تہائی حصہ "بادۂ سرجوش" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

حضرت جوشؔ عادات و خصائل میں بہت سادہ ہیں، اکل و شرب میں بھی انتہا سے زیادہ سادہ مزاج ہیں، تیس سال سے نکودر ضلع جالندھر میں مقیم ہیں، اور رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔

کلام کا نمونہ یہ ہے

دُور کر دیتا ہے راہِ شوق کی تاریکیاں — شمع بنجاتا ہے پروانہ جل جانے کے بعد

سرگذشتِ اہلِ محفل ہے بہت ناگفتنی — شمع کو معلوم ہے سب کچھ مگر خاموش ہے

اب اس شکوہ سے کیا حاصل کہ رہبر خود غرض نکلا
پرائی آس جو تکتے ہیں اکثر خوار ہوتے ہیں

یہی التجا ہے کہ اے خدا مجھے حشر سے تو معاف رکھ
وہ ترے حضور میں آ کے کیا جو کسی کو منہ نہ دکھا سکے

یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی، یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی
اسے شوقِ دید عطا کیا جو نگہ کی تاب نہ لا سکے

غزل گوئی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے نمونتاً ایک غزل درج کرتا ہوں ؎

اتنا گمراہ نہ کر ناصحِ ناداں مجھ کو
بڑھ کے ایمان سے ہے وہ دشمنِ ایماں مجھ کو

سوزشِ داغ درونِ دل سے نظر آتا ہے یہی
پھونک دیگا یہ چراغِ تہِ داماں مجھ کو

ہوسِ سیرِ گلستاں ہے خدا خیر کرے
خواب میں بھی نظر آتے ہیں گلستاں مجھ کو

اسکے چکر میں کبھی یہ یاد ہوا جاتا ہوں
گردشِ جام بھی ہے گردشِ دوراں مجھ کو

گھر سے وحشت میں نکلتا ہوں جو صحرا کی طرف
پاؤں پڑ پڑ کے مناتا ہے گریباں مجھ کو

کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دمساز نہیں
کس جگہ چھوڑ گئی عمرِ گریزاں مجھ کو

دولتِ کفر کی امید نہ چھوڑوں گا کبھی
مل ہی جائے گا کوئی دشمنِ ایماں مجھ کو

آج وہ شانِ کریمی ہیں دکھانے والے
کہیں رسوا نہ کرے تنگیِ داماں مجھ کو

گھر بیاباں میں بنایا تو یہ رتبہ پایا
سر پہ دیتے ہیں جگہ خارِ مغیلاں مجھ کو

میرے اعمال ہوں سرسبز الٰہی کیونکر
تو نے پیدا ہی کیا سوختہ ساماں مجھ کو

گرم اشکوں سے مرے دل کی لگی کیا بجھتی
کر گئے اور بھی یہ شعلہ بداماں مجھ کو

ہوسِ جاہ رہی مانعِ طاعت اے جوش
سروساماں نے کیا بے سروساماں مجھ کو

محروم

تلوک چند نام، محروم تخلص، تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر اب پچپن برس کی ہے، اس لئے ۱۸۸۵ء کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔ انگریزی کی تعلیم بی۔اے تک ہے۔ ابتدائے ملازمت سے ابتک معلم رہے، اب ایک کنٹونمنٹ بورڈ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ جذبۂ شاعری بچپن سے طبیعت میں بدرجہ اتم راسخ تھا، بارہ تیرہ برس کے ہوں گے کہ خود بخود موزوں مصرعے زبان پر آنے لگے، مگر چونکہ زبان سے واقفیت نہ تھی اس لئے ان کے ابتدائی اشعار لسانی نقائص سے خالی نہیں ہیں شروع ہی سے محروم کی نظمیں پنجاب کے اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگیں شاعر نے نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور نہ کبھی کسی سے کوئی اصلاح لی۔ اپنے مذاقِ سلیم کے بل پر اپنے کلام کی اصلاح خود کرنے لگے۔ محروم نے غزلیں بہت کم کہی ہیں، زیادہ تر نظمیں لکھتے ہیں۔ ان کے کلام کا ایک ضخیم مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

محروم کا کلام بہت بلند پایہ ہے۔ اکبر الہ آبادی نے مندرجۂ ذیل رُباعی لکھ کر ان کے کلام کی داد دی ہے ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم — لفظوں کا جمال، معانی کا ہجوم

ہے ان کا سخن مفید و اَنکش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

محروم ایک غزل گو کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ناظم کی حیثیت سے ملک کے گوشے گوشے میں مشہور ہیں، ان کی نظموں کی خصوصیات کے متعلق سر عبدالقادر تحریر کرتے ہیں۔

"الفاظ کی برجستگی، بندش کی چُستی، خیالات کی پاکیزگی

حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں، مگر ان کی شاعری کا جو وصف خاص طور سے پسند ہو وہ یہ ہو کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہو۔ دنیا کے سب بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں جناب محروم کے پیش نظر ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں۔" (گنج معانی)

دوسری جگہ اس طرح ان کے کلام کی تعریف کی ہو۔

"ایک اور چیز جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہو وہ کیفیت غم ہو بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہو۔ محروم کی درد بھری طبیعت دوسروں کے درد کو بھی معمول سے زیادہ محسوس کرتی ہو۔ ان کے کلام میں بہت سے حصے جوانوں اور بچوں کے لئے نصیحت آمیز ہیں۔"

(گنج معانی)

محروم نے اپنے کلام کا ایک حصہ اپنی جواں سال بیوی کے انتقال پر مخصوص طور سے لکھا ہو جو بہت ہی دردناک ہو۔ محروم کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہو

نظم

"تو ہی تو ہو"

تضمین کے چند بند

مہ و مہر کی جلوہ سامانیوں میں — طیور سحر کی نواخوانیوں میں
فضائے چمن کی گل افشانیوں میں — ہواؤں میں، خشکی میں اور پانیوں میں

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہو

نہیں گو بہ قید مکان و زماں تو — زمیں پر، فضا میں، سر آسماں تو
کہوں کیا کہاں ہو نہیں ہو کہاں تو — نہاں تو، عیاں تو، یہاں تو، وہاں تو

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

بچّہ

ایک اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تو
کس وطن کی یاد میں روتا ہوا آیا ہے تو

کونسی دُنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے
رونے والے! یاد کس کس کی رُلاتی ہے تجھے

کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تو
گلشنِ فردوس سے منھ موڑ کر آیا ہے تو

یاد ایسے ہی تو کچھ آتے ہیں نظّارے تجھے
اجنبی سے اس جہاں کے نقش ہیں سارے تجھے

کس لئے حیرت سے یوں ہر اک کا منھ تکتا ہے تو
کچھ تو کہنا چاہتا ہے، کہہ نہیں سکتا ہے تو

ہم کو بھی معلوم ہو تو ہے مُسافر دُور کا
مطلقاً اس دیس کی بولی سے ہے نا آشنا

ہاں بتا وہ سرزمینِ عافیت تھی کون سی
بستی ہے دل میں ترے دلخواہ بستی کون سی

"طوفانِ غم" ان کے کلام کا وہ حصہ ہے جو اُنھوں نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر لکھا ہے، اس کے مختلف عنوان ہیں، انہیں سے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

گذرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی
شباب پر ہے تمہارا تو بال بال ابھی

عروج پر ہے عروسانہ حال ڈھال ابھی
نہ لاؤ موت کا دل میں ذرا خیال ابھی

تمہارے مرنے کے اے جاں یہ دن نہیں ہرگز
جہاں سے اُٹھنے کو یہ سال و سن نہیں ہرگز

دوا دوش مری بیکار جائیگی افسوس
دُعا مرے نہ کسی کام آئیگی افسوس

اجل جہاں سے تمھیں آج اُٹھائیگی افسوس
زمانہ بھر کے ستم مجھ پہ ڈھائیگی افسوس

فلک کو رحم نہ دو یا دتی پہ آئے گا
غریب و بیکس و معصوم کو ستائے گا

لو اُٹھ کے بیٹھو کہ دو یا سرہانے آئی ہے
تمہارے منھ سے وہ دامن اُٹھانے آئی ہے

ادائے طفلی کوئی تو دکھانے آئی ہے
کہ ہنستی آئی ہے تم کو ہنسانے آئی ہے

وہ چل کے آئی ہے گھٹنوں پہ تھک گئی ہوگی
تمہارے پیار سے پھر اس کو تازگی ہوگی

اپنی نظموں میں سے ایک میں دُنیاوی رشتوں کی ناپائداری کی طرف
یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن — رشتے یہ جتنے اُلفت و مہر و وفا کے ہیں
محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم — جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں
کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی — اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

حضرت اکبر الہ آبادی نے جب محروم کو دادِ سخن ایک رُباعی میں بھیجی تو
محروم نے مندرجۂ ذیل رُباعی میں جواب تحریر کیا۔ ؎

طبعِ موزوں خدائے برتر سے ملی — تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں — جب دادِ سخن جنابِ اکبر سے ملی

دیگر رُباعیاں اور قطعات مُلاحظہ ہوں ؎

ہنگامہ ترا ہی گرم ہر اک سو ہے — تیرے دم سے ہی جتنی ہا و ہُو ہے
دل سے پیہم یہی صدا اُٹھتی ہے — تو ہی تو ہے جہاں میں تو ہی تو ہے

جو کچھ کہ ہے مستعار دیتی دُنیا — ہے وقتِ سفر سنبھال لیتی دُنیا
دانا ہے تو تخمِ خیر بوئے جا تو — آخر ہے آخرت کی کھیتی دُنیا

اُس پرندے کی طرح دُنیا میں رہنا چاہیے — چہچہاتا ہے خوشی سے جو کہ نازک شاخ پر
جھولتی ہے شاخ لیکن خوف کچھ اس کو نہیں — گر نہیں سکتا کہ ہیں موجود اُڑ جانے کو پَر

مصروفِ کارِ نیک رہو تم تمام دن — تا شب کو پاؤ لذتِ فردوس خواب میں
پیری میں رہنا چاہو اگر نوجوان تم — دامانِ کارِ خیر نہ چھوڑو شباب میں

وہ طرزِ زیست ہو کہ جو مانگو دعا کبھی
ہو غیب سے نہ پاس ہویدا جواب میں

"نگار" جنوری و فروری ۱۹۴۲ء میں بزم نگار کے تحت میں پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

"محروم کہنہ مشق شاعر ہیں اس لئے وہ غزلیں کبھی لکھ لیتے ہیں اور غزلوں میں پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ انکی غزلیں ایک شاعرانہ مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں محروم کی آواز بلند اور کسی حد تک کرخت ہے، نرم اور لوچ کی نمایاں کمی ہے، شیرینی کا نام و نشان بھی نہیں معلوم ہوتا ہے، محروم شاعر نہیں خطیب ہیں۔ اپنے جذبات سیدھے سادے پیرایہ میں بیان نہیں کرتے بلکہ کسی کو مخاطب کر کے پیغام عمل دیتے ہیں یا کبھی معلم کے لہجہ میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں، زور کلام میسر ہے، لیکن جوش پر دسترس نہیں، ان میں ایک قسم کی خشکی بھی ہے جس سے اثر اور زیادہ خوشگوار ہوجاتا ہے۔"

محروم کے کلام پر جو کلیم صاحب نے اتنی زبردست تنقید کی ہے وہ محروم کے ایک جملہ میں یوں ادا ہو گئی ہے:

"غزل میرا موضوع نہیں، اگرچہ کچھ غزلیں لکھی ضرور ہیں۔"

"نگار" کے اسی نمبر میں تبصرہ فرماتے ہوئے پروفیسر آل احمد صاحب سرور فرماتے ہیں۔

"وہ غزلیں بھی اچھی کہہ سکتے ہیں۔ محروم کے یہاں قدرتی طور پر اقبال کا اثر نمایاں ہے، مگر ان کا مزاج اقبال سے مختلف ہے"



وحشی

کرشن سہائے تہکار ہی نام، وحشی تخلص، قوم کایستھ، وطن فتح پور، آپ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی آپ کو اپنے والدین سے ورثہ میں ملی تھی، انگریزی تعلیم آپنے وکالت کے پیشہ کی غرض سے حاصل کی تھی۔ ابتدا میں آپ کو شاعری سے کوئی لگاؤ نہ تھا، مگر ایک ایسا سانحہ گذرا جس کی وجہ سے آپ شعر و شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہوا جس کا اثر آپ کے دل و دماغ پر پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ اپنے اُن جذبات کو روک نہ سکے اور وہ اوزان شاعری کا جامہ پہن کر افق ادب پر جلوہ گر ہو گئے۔

۱۹۲۳ء ہی سے آپ کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ آپنے کبھی کسی شاعر سے اپنے کلام پر اصلاح نہیں لی۔ اس کی وجہ یہ خیال تھا کہ "میرا ذوق سلیم خود میری راہنمائی کرے گا۔ اگر اردو کے میر اور غالب جیسے شعرا کے کلام میں خامیاں نکل سکتی ہیں تو میرے کلام میں خامیاں ہونے سے میرے جذبات اور احساسات پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ ان سے میری توقیر کم ہو سکتی ہے"۔ یہ باتیں آجتک جناب وحشی کے ورد زبان ہیں۔ آجکل آپ کان پور میں وکالت کرتے ہیں اور ایک کامیاب ایڈوکیٹ ہیں۔

آپ کا کلام بے نظیر ہے، آپنے غزل، نظم، اور رُباعیات میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ دیگر اصناف شاعری کی طرف آپنے توجہ نہیں کی۔ دوسری کل ہند اردو کانفرنس کے موقع پر جب عالی جناب سر عبدالقادر صاحب تشریف لائے تھے اور انھوں نے اقبال مرحوم کی تصویر کی پردہ کشائی کی تھی تو آپنے اپنی یہ بلند پایہ اور مقبول عام نظم پڑھی تھی۔

"نور جہاں"

سو رہا ہو منھ چھپائے کون یہ زیرِ زمیں　　ہو صبا لرزاں کہ آجائے نہ پیشانی پہ چیں
دے رہی ہو لوریاں اسطرح بوئے یاسمیں　　جیسے ہو مصروفِ خواب نازکوئی نازنیں
نغمہ ریزِ عشق ہو سنسان جنگل کی ہوا
پردہ دارِ حسن ہو تاریک راتوں کی فضا

رو رہی ہو بیکسی یہ شمعِ تربت زار زار　　ہنس رہی ہو دیکھ کر یہ گردشِ لیل و نہار
آرزوئیں چھا رہی ہیں قبر پر بن کر غبار　　حسرتیں سر پیٹتی ہیں فرطِ غم سے بار بار
سونیوالے خاک کے بستر پہ آنکھیں اپنی کھول
کون ہو تو اور کہاں سوتا ہو منھ سے کچھ تو بول

دیکھ کر تربت گماں ہوتا ہو دل میں بار بار　　ہو نہ ہو عہدِ جہانگیری کی ہو یہ یادگار
طنطنہ شاہنشہی کا دفن ہو زیرِ مزار　　دم بخود ہو اس لئے ساری فضائے مرغزار
این چہ منظر ہست یارب زیرِ چرخِ چنبری

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

کتنی حسرتناک ہو دُنیا میں تیری داستاں　　کتنا عبرت خیز ہو منظر ترا نورِ جہاں
بے شمار افواج تھیں جس جا پہ تیری پاسباں　　سو رہی ہو بے خبر تو آہ اب تنہا وہاں
یا کہ ویرانیِ صحرا پاسبانی می کند
یا کنوں شمعِ شبستاں نوحہ خوانی می کند

جب بہارِ شعلہ رو گلشن میں ہوتی ہو عیاں　　لالہ و گل سے بھڑک اُٹھتا ہو سارا گلستاں
دیکھ کر اس بیکسی کے حال میں تجھ کو یہاں　　ایک دریا خوں کا ہو جاتا ہو آنکھوں سے رواں
چوں گُہر از ابرِ نیساں در بہاراں می چکید
از ہزاراں چشمِ نظارہ گلستاں می چکید

یاد آیا میکہ جب کافر جوانی تھی تری　　یاد آیا میکہ جب گھر گھر کہانی تھی تری

یاد آیا میکہ جب یہ زندگانی تھی تری — سلطنت کیا شہ کے دل پر حکمرانی تھی تری

یاد ہو تیری جبیں پر چیں کا آنا یاد ہو
خوف سے سارے جہاں کا سہم جانا یاد ہو

یاد آیا میکہ تو جب حسن کی تصویر تھی — زلف تیری خم بہ خم صد حلقۂ زنجیر تھا
جب ترے ابرو کی جنبش جنبشِ شمشیر تھی — جب تری آنکھوں کی گردش گردشِ تقدیر تھی

بادۂ عیش و طرب سے جبکہ تو مخمور تھی
نشۂ جوشِ جوانی میں سراپا چور تھی

خلوتِ شہ میں وہ تیری آنکھ شرمائی ہوئی — لب پہ دزدیدہ تبسم کی جھلک آئی ہوئی
زلفِ مشکیں عارضِ گلگوں پہ لہرائی ہوئی — جیسے ساون کی گھٹا خورشید پر چھائی ہوئی

شاہ سے خلوت میں اب تیری ملاقاتیں کہاں
حسن کی اور عشق کی اب آہ وہ گھاتیں کہاں

وہ ہوائے روح پرور اور وہ فصلِ بہار — چاندنی راتوں کا منظر اور وہ جمنا کا کنار
دستِ سیمیں کا ترے وہ شاہ کی گردن میں ہار — جان و دل سے شاہ کا وہ تجھ پہ ہو جانا نثار

وہ کنارِ آبِ جو موجوں کی نغمہ ریزیاں
شاہ کے ہمراہ وہ تیری طرب انگیزیاں

خطۂ کشمیر میں "گل مرگ" کا وہ لالہ زار — اودی اودی وہ گھٹائیں اور وہ ہلکی سی پھوار
اک طرف سروِ رواں اور اک طرف گل کی قطار — اک طرف قمری کی کو کو اک طرف صوتِ ہزار

فرشِ گل پر ناز سے چلنا ترا مستانہ وار
دیکھنا وہ شوق سے شہ کا بہارِ اندر بہار

جب ہوا نیرنگیِ دوراں سے پیدا انقلاب — توڑ ڈالا ایک جھونکے نے طلسماتِ حباب
اب نہ سوزش عشق کی نے گرمیِ حسن و شباب — نے کنارِ آبِ جو نے محفلِ چنگ و رباب

اب نہ ساقی ہے نہ وہ آوازِ نوشا نوش ہے
جس طرف اب دیکھئے اک منظرِ خاموش ہے

ہو گئیں کچھ آرزوئیں شاملِ رنگِ بہار | بچ رہیں جو رفتہ رفتہ اُڑ گئیں بنکر غبار
سر تیں بھی مٹ گئیں سب خاک میں زیرِ مزار | کون ہو اب بھر میں تیرا شریکِ حالِ زار

سوگوار اب شامِ غربت کے سوا کوئی نہیں
غمگسار اب شمعِ تربت کے سوا کوئی نہیں

دامنِ صبر و شکیبائی ہوا جب تار تار | بجھ گئی شمعِ لحد بھی ہو کے آخر اشکبار
اب نہ مونس رکھیا کوئی نہ کوئی غمگسار | اب یہی آتی ہے تربت سے صدا اے دلفگار

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

وحشی ایک بلند پایہ غزل گو بھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں تغزل بدرجہ اتم موجود ہے، بعض اشعار حقائقِ روزگار سے متعلق ہیں۔ تصوف کی ہلکی سی جھلک جگہ جگہ عیاں ہے۔ زبان میں روانی اور سلاست موجود ہے مگر فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام میں زور پیدا کرتے ہیں۔ نظموں میں تو جگہ جگہ فارسی الفاظ، فارسی فقرے فارسی ترکیبیں اور فارسی کے اشعار استعمال کر جاتے ہیں۔ یہاں ان کی ایک غزل اور چند رُباعیوں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے منتخب مفرد اشعار بھی ان کے مسلم الثبوت غزل گو ہونے کا دیتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں۔

زمیں سے آسماں تک آسماں سے لامکاں تک ہے
ذرا پروازِ مشتِ خاک تو دیکھو کہاں تک ہے

تلاش و جستجو کی حد فقط نام و نشاں تک ہے
سُراغِ کارواں بھی بس غبارِ کارواں تک ہے

جبینِ شوق کو کچھ اور بھی اذنِ سعادت دے
یہ ذوقِ بندگی محدود سنگِ آستاں تک ہے

نو یدِ رستگاری پر عبث دل شاد ہوتی ہے
ابھی صدگام اے بلبل قفس سے آشیاں تک ہے

سراپا آرزو بن کر کمالِ مدعا ہو جا
وہ ننگِ عشق ہے جو آرزو آہ و فغاں تک ہے
بڑھائے جا قدم راہِ طلب میں شوق سے وحشی
کہ حدِ سعیِ لاحاصل فقط کون و مکاں تک ہے

رُباعیات

دیکھو دیکھو حیاتِ فانی دیکھو / دریا میں حباب کی روانی دیکھو
او نام پہ زندگی کے مرنے والو / سر سے وہ گزر رہا ہے پانی دیکھو

(۲)

آ دل میں فضائے طور بن کر چھا جا / رگ رگ میں صفاتِ نور بن کر چھا جا
اے ساقیِ بزمِ کُن میں صدقے تیرے / آنکھوں میں مری سُرور بن کر چھا جا

(۳)

جو حُسن میں آ کے ناز بن جاتا ہے / اور عشق میں جو نیاز بن جاتا ہے
جو نغموں میں جا کے ساز بن جاتا ہے / دل میں مرے آ کے راز بن جاتا ہے

(۴)

جب گلشنِ دہر میں تھا مسکن میرا / پھولوں سے بھرا ہوا تھا دامن میرا
اب بعد فنا سبک ہوں اتنا وحشی / ہر نکہت میں گلوں کے ہے نشیمن میرا

مفرد اشعار

ہوش و خرد کا راہِ جنوں میں گزر نہیں / یاں باخبر وہ ہے جسے اپنی خبر نہیں
ادراک کر لیا ہے وہاں عشق نے تجھے / احساس و وہم کا بھی جہاں رہگزر نہیں
دُنیائے عشق میں دلِ ناآشنائے غم / ایسی کبھی ایک شام ہے جس کی سحر نہیں

یقت میں وہی اس بحرِ ہستی کا شناور ہے
جو موجوں کا سہارا لیکے پھر موجوں سے باہر ہے

یے ذوقِ طلب سمجھوں کہ تکمیلِ جنوں سمجھوں
تری صورت کا ہر ذرّے پہ ہوتا ہو گماں مجھ کو

ق اگر حسن کے پردہ میں نہ پنہاں ہوتا
دشت تو دشت ہو گلشن بھی بیاباں ہوتا

ہ پردوں سے تو یہ حسنِ شرر باری ہو
پھونک دیتا یہ دو عالم کو جو عریاں ہوتا

ائے پھرتی ہو سب کو ہوا زمانے کی
خبر کسی کو نہیں اپنے آشیانے کی

وحشی ایک صوفی منش، فقیر دوست بزرگ ہیں، اور ایک خاص کیف
عالم میں شعر کہتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں بڑی محنت اور جگر کاوی کے بعد
ہیں، ان کے دل کا درد اُن کے کلام میں بھی اثر پیدا کر دیتا ہو اسلئے
سنتا ہو وہ سر دُھنتا ہو۔

جگر

منشی شیام موہن لال نام، جگر تخلص، وطن بریلی، ان کے آباؤاجداد قنوج سے آکر بریلی میں آباد ہوئے تھے، سرکاری ملازمت ذریعۂ معاش تھا، رفتہ رفتہ کچھ جائداد بھی پیدا کر لی تھی۔ اس خاندان کے چشم و چراغ منشی گوبند رام مرحوم کے فرزند اکبر رائے بہادر منشی درگا پرشاد تھے۔ آپ عربی، فارسی اور سنسکرت کے جید عالم تھے۔ سلسلۂ ملازمت میں ترقی کرتے کرتے انسپکٹر مدارس کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہو گئے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے رائے کنہیا لال جگر کے والد تھے۔ جگر سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، ایک مکتب میں اردو فارسی پڑھنے لگے۔ سنہ ۱۶ء میں بی اے کا امتحان بریلی کالج سے پاس کیا۔ سنہ ۱۸ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ گو افتاد طبیعت اس ملازمت کے خلاف تھی، لیکن چار و ناچار اس ملازمت کو اختیار کرنا پڑا۔ جو صاحبان جگر سے واقف ہیں، ان کو یقین تھا کہ جگر اس ملازمت میں سرسبز نہ ہوں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت جگر ابتک نائب تحصیلدار ہی ہیں۔ بارہا ترک ملازمت کا ارادہ کر چکے ہیں، مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

جگر عزیز لکھنوی کے شاگرد رشید ہیں۔ تقریباً گذشتہ پچیس تیس برس سے مشق سخن جاری ہے۔ نظم میں سو صفحات کے قریب غزلیات ہیں۔ تین چار سو صفحات کی نظمیں۔ ایک مستقل مثنوی "پیام ساوتری" جس میں بارہ سو سے زائد اشعار ہیں ایک اس سے چھوٹی مثنوی ہے "گرشن سداماں" جس میں تین سو اشعار ہیں۔ ایک چھوٹا سا مجموعہ بچوں کی نظموں کا ہے۔

جگر ایک خاموش طبع، سنجیدہ مزاج اور شریف النفس ادیب ہیں۔

ان کے کلام میں درد کی ٹیس، محبت کی لپٹ اور فرشتہ کی معصومیت پائی جاتی ہے۔ اشعار میں فقر، قناعت، بے نیازی، اور حزن کے علامات موجود ہیں، ان کی نظمیں نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں۔

پپیہا اور پی کہاں

سامنے پیپل کی ٹہنی پر یہ بیٹھا آ کے کون — دیتا ہے آواز کس کو درد سے چلا کے کون
نالہ کش ہے فرقتِ دلبر کا صدمہ پا کے کون — پی کہاں رٹتا ہے تنہائی کسو لیں گھبرا کے کون
کون خارِ دشتِ وحشت ہے پئے داماں ہوش
کس کی یہ آواز ہے غارت گرِ سامانِ ہوش

ہے زباں سوزِ دروں کی ترجمانی کے لئے — چشمِ پرنم سیلِ گریہ کی روانی کے لئے
سینۂ بریاں تپش ہائے نہانی کے لئے — زندگی تیری ہے سوزِ جاودانی کے لئے
بیقراری سے نگاہِ دیدۂ بسمل ہے تو
اضطراب اعضا میں ہے گویا خود اپنا دل ہے تو

کتنا عبرت خیز ظالم ہے ترا اندازِ درد — چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر تری آوازِ درد
مُردہ دل کو ہے دمِ عیسیٰ ترا اندازِ درد — ہر نفس ہمدردِ درد اور ہر صدا دمسازِ درد
نالۂ جانسوز ہے، آہِ دلِ ناشاد ہے
تو پپیہے شمعِ خلوت خانۂ فریاد ہے

کس کے دردِ ہجر سے دن رات چلاتا ہے تو — کس کے آزارِ محبت میں گھلا جاتا ہے تو
کس کی لو میں جل کے منہ سے آگ برساتا ہے تو — کس کے غم میں ہر گھڑی خونِ جگر کھاتا ہے تو
تو پپیہے آہ کس کا کشتۂ بیداد ہے
کون ہے وہ پی جو وجہِ نالہ و فریاد ہے

ہمالہ سے دو دو باتیں

بھلا مجال کہاں مجھ سے بے زبانوں کی — کہ منھ سے بات کہوں کچھ فلک نشانوں کی
ترے وجود سے عالم یہ ہو گیا روشن — کہ خاکِ ہند میں رفعت ہو آسمانوں کی
وہ پھول ہیں ترے دامن میں سامنے جنکے — بہار گرد ہو دُنیا کے گلستانوں کی
گپھاؤں سے تری نکلیں تھیں ساری عالم میں — صدائیں گونج اُٹھیں توحید کے ترانوں کی
بلندیوں سے تری جب یہ رواں ہوئے چشمے — حیات جن سے ہے دُنیا کے باغبانوں کی
مے مجاز میں جو نشۂ حقیقت ہے — وہ یادگار ہو توعشق کے فسانوں کی
تری بلندی غرور و وقار کے آگے — چلی نہ ایک ہوائی جہاز رانوں کی
وہ صُور پھونک دے اپنے لبِ مبارک سے — کہ یاد تازہ ہو بھولے ہوئے فسانوں کی

اٹل ہوں جن کے ارادے خیال جن کے بلند
اُٹھیں اب ایسے زمینِ وطن سے حوصلہ مند

غزلیات

جان اُن پر نثار کرتا ہوں — مژدہ اے زندگی کہ مرتا ہوں
کیا کہوں زندگی کا حالِ کل — جبر سہتا ہوں، صبر کرتا ہوں

دل سے طاعت تری نہیں ہوتی — ہم سے اب بندگی نہیں ہوتی
ایسی کچھ بیدلی سی غالب ہے — کہ تری یاد بھی نہیں ہوتی

مانا بہت جنوں نے سبکدوش کر دیا — سر ہے تو سر کے ساتھ ہیں بارِ گراں کئی
کیا زندگی سے ہو کوئی عہدہ برآ جگر — اک جانِ زار اور غمِ جانستاں کئی

ہم نے مانا کہ عمر فانی ہے
موت تمہید زندگانی ہے

سوزِ عشق اصل زندگانی ہے
داغِ دل مہر کامرانی ہے

موت جبتک نظر نہیں آتی
زندگی راہ پر نہیں آتی

ترک تدبیر بھی نہیں آساں
راس تدبیر اگر نہیں آتی

مرکزِ دل پہ جو نہیں قائم
وہ نظر راہ پر نہیں آتی

دل کو لذّت شناسِ غم کرلیں
موت ہم کو اگر نہیں آتی

جس نے تیری نظر کو دیکھ لیا
اس کو دنیا نظر نہیں آتی

اندر جیت شرما

اندر جیت شرما نام، ۳ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو بمقام کھر کودہ ضلع میرٹھ پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اردو ہندی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ٹریننگ اسکول اور نارمل اسکول کے امتحانات میں کامیاب ہو کر پیشۂ معلمی اختیار کیا، ۲۲ء میں پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۲۵ء سے ۴۰ء تک ماحیرہ فائنل اسکول میں بطور معلم انگریزی تعلیم دیتے رہے۔ مئی ۴۰ء سے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ تقریباً پندرہ سال سے باقاعدہ طور پر شعر کہتے ہیں۔ مولانا نادرت میرٹھی کے شاگرد ہیں۔ ۳۰ء میں ان کا کلام "نیرنگ فطرت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ یو پی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے مڈل مدارس کے مدرسین کے لئے منظور کیا ہے۔ علاوہ ازیں سی پی اور بمبئی کی حکومتوں نے لائبریریوں اور انعامات کے لئے پسند کیا ہے، اسکی اکثر نظمیں مختلف صوبوں میں کورسوں میں منتخب کی گئی ہیں۔ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ۳۲ء میں بعنوان "جلوہ زار" شائع ہوا۔ یہ دونوں مجموعے ملک میں بہت مقبول ہوئے۔ اپنے کلام کے بارے میں شرما جی فرماتے ہیں۔

"ابتک تقریباً تین سو نظمیں مختلف موضوعات پر لکھی ہیں، زیادہ قدرتی مناظر پر ہیں، ساٹھ کے قریب غزلیں اور پچاس کے قریب گیت لکھے ہیں۔ اکثر گیت ریکارڈوں پر بھرے جا چکے ہیں۔"

سالہا سال سے شرما جی کا کلام زمانہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کے گیت اور نیچرل و قومی نظمیں دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

فلسفۂ دنیا

سرمایۂ سکوں ہے نہاں اضطراب میں
دریا کی روح بند ہے یک یک حباب میں

بیدار ہے وہی جو ہے دنیائے خواب میں
یعنی ہر ایک حسن ہے عریاں حجاب میں

ہے آشکار جوشش خزاں میں بہار کا
آوازۂ زغن میں ہے نغمہ ہزار کا

دنیا کی زندگی کو فنا پر ثبات ہے
ہر اک حباب ساغرِ آبِ حیات ہے
تاریکیوں میں نور کی سب کائنات ہے
باطن ہے جس کا نام وہی حق کی ذات ہے
حدِ زوال موجبِ قدرِ کمال ہے
جامِ مے فراق میں لطفِ وصال ہے

انساں جہاں میں ہوتا ہے بدیوں سے نیکنام
مضمر زبانِ گنگ میں ہے خوبیِ کلام
لذت سے آبِ سرد کی واقف ہے تشنہ کام
تکلیف کا نظام ہے آرام کا نظام
ضدین پہ ہر ایک کا قائم اساس ہے
ظاہر میں جو ہے دور حقیقت میں پاس ہے

الحاد کے نشان نے ایماں بنا دیا
حیوان کے وجود نے انساں بنا دیا
جب میزباں بنا دیا مہماں بنا دیا
اک لفظ تھا نہیں نے جسے ہاں بنا دیا
انساں کی لغت میں جب انکار آ گیا
خود غیب سے ظہور میں اقرار آ گیا

ہے علم کا وجود جہالت کے واسطے
کثرت کا امتیاز ہے وحدت کے واسطے
سیرت کا ہے خیال جو صورت کے واسطے
جز و لطیف بھی ہیں کثافت کے واسطے
افسردگی نہ ہو تو کبھی تازگی نہ ہو
خشکی اگر نہ ہو تو نمایاں تری نہ ہو

مسند کا دھیان آتا ہے بالیں کے سنگ سے
محفل طرب کی گرم ہے ماتم کے رنگ سے
پیغامِ صلح ملتا ہے روحوں کو جنگ سے
امن و اماں کا راج ہے توپ و تفنگ سے
اوجھل ہوا نظر سے تو سمجھو وصال ہے
ماضی کے رنگ روپ میں تصویرِ حال ہے

آواز یہ نکلتی ہے ہستی کے ساز سے
بنیاد ہے جہاں کی نشیب و فراز سے

بنا ہی قلب آئینہ سوز و گداز سے ہر قدر حسن و عشق کی ناز و نیاز سے

قائم اسی اُصول پہ رنگِ زمانہ ہی

فطرت کا کاربند یونہی کارخانہ ہی

نسیمِ سحر

کس ناز کس انداز سے نسیمِ سحر چلی بو کی طرح رواں ہوئی مثلِ نظر چلی

باغوں کا رُخ کیا تو گراتی ثمر چلی شبنم کی پتّیوں کو لٹاتی گہر چلی

پھولوں کے جام بادۂ ہستی سی بھر چلی اہلِ چمن کو خواب سے بیدار کر چلی

رُوئے چمن کو دیکھ کے زینت مچل پڑی

سبزے کو چھیڑ چھاڑ کے لہرا کے چل پڑی

غنچے گلوں کے چشمِ زدن میں کھلا چلی خوشبو کے اور شمیم کے دریا بہا چلی

سجدے میں شکر کے لئے شاخیں جھکا چلی چڑیوں کو شاخ شاخ پہ جھولا جھلا چلی

پتّوں کو لڑ کھڑا دیا باجا بجا چلی بزمِ طرب کا رنگ چمن میں جما چلی

سنبل کو زلف ناز کو سلجھا کے چل پڑی

دامن کو خار خار سے اُلجھا کے چل پڑی

غزلیات

اہلِ جنت کو مبارک ہوں فرشتوں کے خیال اہلِ دُنیا کو فقط چاہیے انساں ہونا

کیا پوچھتے ہو حال دلِ داغدار کا پہلو میں دیکھتا ہوں تماشا بہار کا

بخشا فروتنی نے یہ رُتبہ کہ بعد مرگ ہر ذرّہ عرش بوس ہی میرے مزار کا

اظہارِ غم کا بعد کو سودا کرے کوئی پہلے اثر کی راہ تو پیدا کرے کوئی

ذوقِ نظر کے ضبط کا ہو اقتضا یہی | کچھ دل کے آئینہ ہی میں دیکھا کرے کوئی
پرواز کا تو بعد میں ہوتا ہو امتحاں | در تو قفس کا پہلے ذرا وا کرے کوئی
تو کھل گیا معمہ حیات و ممات کا | اک انقلاب زیست میں پیدا کرے کوئی

ہر شے میں ترا یارب جلوہ نظر آتا ہو | جس کوہ پہ جاتا ہوں سینا نظر آتا ہو
معلوم یہ ہوتا ہو بس فرق جزو کل میں | قطرے کی مجھے تہ میں دریا نظر آتا ہو
مجنوں کی نگاہوں سے تو دیکھ ذرا اے غافل | یعنی کہ ہر اک ذرہ لیلا نظر آتا ہو
ہستی کے سفینہ کو ساحل ہو کہاں حاصل | دریائے فنا میں یہ ڈوبا نظر آتا ہو

سینے میں تڑپتا ہو ارماں ترے ملنے کا
لیکن اسے کب کوئی رستا نظر آتا ہو

اندرجیت شرما صاحب کے کلام میں دلکشی، جاذبیت، سادگی اور پرکاری کی علامات بہتات کے ساتھ موجود ہیں۔

شرما کے گیت کہاں ہیں؟

دادِ حسرت

وفا

پنڈت میلا رام نام، وفا تخلص ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی
وطن موضع دیپو کے ضلع سیالکوٹ میں ہے۔ ان کے والد اس موضع کے کاشتکار تھے
ان کی ابتدائی تعلیم ان کی ننہال موضع قلعہ صوبہ سنگھ میں ہوئی، اس کے بعد
ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان اسکاچ مشن
ہائی اسکول سیالکوٹ سے پاس کیا۔ کچھ عرصہ تک مشن کالج لاہور میں پڑھتے
رہے، مگر خانگی معاملات میں مشکلات ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم کا سلسلہ
آئندہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۱۵ء میں اس دور کے مشہور اخبار "دیش" میں
اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔

پنڈت جی کی اخباری زندگی بہت کامیاب رہی۔ بندے ماترم، بھیشم،
ویر بھارت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں مشہور ہوئے۔
اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ انھوں نے اپنے فرائض کو نہایت محنت، دیانت
اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمیشہ معقول
مشاہرہ پاتے رہے، لیکن جہاں پالیسی کے معاملات میں اختلاف ہوا فوراً
اپنے عہدہ سے سبک دوش ہو گئے، ۱۹۳۲ء میں ویر بھارت سے بھی ان کی
علاحدگی خودداری اور ضمیر پروری کا نتیجہ تھی۔ ویر بھارت کے چھوڑنے کے بعد
اخباری زندگی سے عملی طور سے کنارہ کش ہیں۔ گو اب بھی وقتاً فوقتاً بروقت
ضرورت لاہور کے مشہور اخباروں میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے
[illegible]ء کی سول نافرمانی میں ایک نظم بعنوان "فرنگی سے خطاب" لکھنے پر انھیں
[illegible] سال کی قید سخت کی سزا ہوئی، یہ نظم ویر بھارت میں شائع ہوئی تھی۔
شعر و سخن کا شوق ان کو طالب علمی کے زمانے سے تھا، کسی اخبار یا رسالہ

میں کوئی غزل یا نظم دیکھ پاتے تو اُسے بڑی توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے۔ جب آٹھویں جماعت میں آئے تب سے وہ بھی شعر کہنے لگے۔ لیکن عام طور سے ہم جماعت طلبا کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ نویں جماعت میں آکر پنڈت راج نرائن ارمان سے اصلاح لینی شروع کی، چار پانچ مرتبہ اصلاح دینے کے بعد انھوں نے لکھ دیا کہ انھیں اصلاح کی ضرورت نہیں، مگر انھوں نے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا اور جب یہ انٹرنس پاس ہوئے تو لاہور پہنچ کر عرصہ تک اُستاد کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے کیونکہ ارمان اس زمانے میں لاہور میں مقیم تھے۔

جب یہ مشن کالج میں پڑھتے تھے تو وہاں ایک دفعہ انعامی مشاعرہ ہوا مقابلہ کی غزلیں برائے فیصلہ علامہ اقبال مرحوم کے پاس گئی تھیں، طرح تھی "خلا نکلے، بلا نکلے" اگرچہ یہ فرسٹ ایر میں تھے، اور مقابلے میں بی اے اور ایم اے کے طالب علم شریک تھے۔ پھر بھی ان کی غزل دوسرے درجہ رہی، لیکن علامہ اقبال نے اس غزل پر جن الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا وہ اور کسی غزل کے حصے میں نہ آئے۔ مرحوم نے لکھا تھا۔

"طالب علموں میں ایسا ذہین سخن سنج میری نظر سے کبھی نہیں گذرا۔ میرا خیال ہو کہ ایک دن یہ شاعری کی دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا، میں اس سے مل کر بڑا خوش ہوں گا۔"

اور اس شعر کی مرحوم نے بہت ہی تعریف کی۔ ؎

بوقت گریہ پاسِ اضطرابِ قلب لازم ہو
جو آنسو آنکھ سے نکلے تڑپتا لوٹتا نکلے

انھیں بیاض رکھنے کی عادت نہ طالب علمی میں تھی اور نہ اب ہو اسلئے زمانۂ طالب علمی کے کلام تو قریب قریب تمام و کمال کھو گیا، مگر بعد کا کلام اخبارات اور رسائل میں چھپ جانے کے باعث بڑی حد تک محفوظ رہ گیا۔ ابتدائی کلام کے جو نمونے دستیاب ہو سکے ہیں وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

ان سے ناظرین اس بات کا اندازہ کر سکیں گے کہ ان کی طبیعت شروع ہی میں کتنی سلجھی ہوئی تھی۔

کھاتے ہیں وہ غیروں کی قسم اور زیادہ
مجبور ہوئے جاتے ہیں ہم اور زیادہ

بس بس فلکِ پیر کہ باقی نہیں مجھ میں
اب طاقتِ برداشتِ غم اور زیادہ

بھلا جس بزم میں غیروں کی کھچڑی پکتی رہتی ہو
وہاں کب اے دلِ ناداں ہماری دال گلتی ہو

منھ کا کہنا اور ہوا اور کر دکھانا اور ہے
ہونے کو کیا ہو نہیں سکتا مگر ہوتا نہیں

کون ہے جو رات ساری بیٹھ کر سنتا رہے
اے وفا تیرا تو قصہ مختصر ہوتا نہیں

دنیا کی آفتیں ہیں غریبوں کے واسطے
آندھی کا زور ہے مری شمعِ مزار پر

اہلِ زمانہ پر تعجب ہوں اے وفا
مرتے ہیں کیوں یہ زندگیِ مستعار پر

تقدیر ہی یہ تھی کہ جواں مر گیا وفا
کچھ تیرا اختیار نہیں میرا بس نہیں

عہدِ آرواں کے شعرا میں ان کا درجہ بہت بلند ہوا اور شعر و سخن کی مجلسوں میں ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے، اس لحاظ سے علامہ اقبال کی پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ متعدد اخبارات و رسائل ان کا کلام شائع کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ یہ بہت بڑے اخبار نویس ہیں، اس سے زیادہ بڑے شاعر ہیں، نظموں میں سیاسی رنگ غالب ہے، مگر غیر سیاسی نظمیں بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

غزلیں کم لکھی ہیں، مگر جو لکھی ہیں، خوب لکھی ہیں، زود گوئی اور پُرگوئی

ان کے نزدیک قابل فخر اوصاف میں داخل نہیں، لیکن جہاں تک زیادہ کہنے
اور جلدی کہنے کا تعلق ہو خود کسی سے پیچھے نہیں، اس کے باوجود کلام میں اشعار
کم ہوتے ہیں بلکہ بالکل بھی نہیں ہوتے۔ زبان کی صفائی، بیان کی روانی،
بندشوں کی چستی، الفاظ کی برجستگی اور مضمون کی بلندی ان کے کلام کی امتیازی
خصوصیات ہیں۔

فراق

رگھوپتی سہائے نام، فراقؔ تخلص، وطن گورکھپور ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے ان کے نامور والد کا نام گورکھ پرشاد تھا۔ یہ عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔ آخر دم تک ان کو اردو شاعری کا ذوق رہا۔ ابتدا میں اردو کی معمولی تین چار کتابیں پڑھیں اور اس کے بعد انگریزی پڑھنے لگے۔ بی، اے پاس کرنے کے بعد پروفیسر ہوئے گورنر نے آئی سی، ایس میں نامزد کر دیا، لیکن تحریک ترک موالات میں شریک ہوجانے کی وجہ سے وہ بہت پریشان ہو گئے۔ کانگریس میں شریک ہوئے قید فرنگ کی پابندیاں جھیلیں، پہلے کرسچین کالج لکھنؤ اور اب الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرار ہیں۔ سارے امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کئے۔ فراقؔ کے خاندان کے لوگ امیرؔ مینائی کے معتقد تھے، انھوں نے بھی پہلے پہل امیرؔ کے کلام سے لطف لینا شروع کیا۔ پروفیسر ناصری مرحوم اور وسیمؔ خیرآبادی سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ فراقؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، یگانہؔ اور اقبالؔ کے کلام کو بہت پسند کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری سے بھی لطف و سرور حاصل کرتے ہیں، اور اسمیں شبہ نہیں کہ اس دور کے ایک نامور رنگیں نوا غزل گو ہیں۔ ساقی اور زمانہ میں ان کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے

تیرے چھونے سے بھی دُکھے جو ۔۔۔ کون اس دل کی پھانس نکالے

تری یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں ۔۔۔ محبت ہے شاید تجھے بھول جانا

یونہی فراقؔ نے عمر بسر کی ۔۔۔ کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں ۔۔۔ تو نے تو خیر بے وفائی کی

تھرتھری سی ہے آسمانوں میں — کچھ تو ہے زور ناتوانوں میں
کتنا خاموش ہے جہاں لیکن — اک صدا آ رہی ہے کانوں میں
کم نہیں بارِ غم سے بادہ نشاط — درد ہے حسن کے بھی شانوں میں
آ گیا عشق بدگماں آخر — حُسن کے بے کلے بہانوں میں
کوئی سوچے تو فرق کتنا ہے — حسن اور عشق کے فسانوں میں
موت کے بھی اُڑے ہیں اکثر ہوش — زندگی کے شراب خانوں میں

کونین کو نیند آ رہی ہے — اُف تیری نگاہ کے فسانے
آتے ہی ترا خیال اے دوست — ہر سمت لگیں گھٹائیں چھانے
آدھا گلزار ہے قفس میں — ویران پڑے ہیں آشیانے
تھا ذکرِ کرم فراق اُس کا — کیوں آنکھ لگی ہے ڈبڈبانے

اے نگاہِ بے محابا تو نے یہ کیا کر دیا — آج دل کو دیکھ کر میں نے بھی پہچانا نہیں
آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے مل کے ایک — تو نے وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

ہوش کی توفیق بھی کب اہلِ غم کو ہو سکی — عشق میں اپنے کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم
رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا — خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم
حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق — مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اک جہاں لاکھوں فسانے عشق تصویرِ سکوت — درمیاں رسوائیاں ہیں رازِ دل افشا نہیں

اہلِ دل حسن کو تری برقِ نظر کہتے ہیں — ہاں وہ اندازِ فنا عشق کو آیا بھی کہاں

ہم نے مانا کہ غمِ ہجر بھی دھوکا ہو فراق — اور اگر غور کریں دل میں تو دھوکا بھی کہاں

فراق کے متعلق پروفیسر سرور کا خیال ہے۔

"مغربی ادب کی وجہ سے ان کی مشرقیت میں زیادہ گہرائی اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے یہاں تنقیدِ حیات کی مسلسل کوشش ملتی ہے، لیکن ایک قسم کا ابہام ضرور ہے۔ ان کی شاعری فانی سے بہت ملتی جلتی ہے، لیکن مکمل غم پرست نہیں، فانی کی پختہ کاری اور شگفتگی بھی ان میں نہیں آئی، ان کے یہاں نفسیاتی تجزیہ بھی اور اجتماعِ ضدین اور ان کی اُکھڑی اُکھڑی مگر منفرد زبان بھی ایک دلکشی رکھتی ہے۔"

پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

"فراق حقیقی معنوں میں شاعر ہیں، نہ صرف شاعر بلکہ نقاد بھی، فراق کی خصوصیت اجتماعِ ضدین ہے، ان کی آواز درد بھری ہے، لیکن شدتِ درد میں بھی وہ اپنی آواز پر کامل اختیار رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری تنقیدِ حیات ہے"۔

ڈاکٹر تاثیر نے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا ہے۔

"فراق نے معشوق سے گذر کر عاشق کو بھی شرمِ احتیاط اور ضبط میں شریک کر لیا ہے، ابھی ناپختہ ہیں، اور اس لئے ان میں ہضم اور تحلیل کم ہے اور رائج تاثرات کو زیادہ شخصی مداخلت کئے بغیر اُگل دیتے ہیں"

مگر پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے۔

"نفسیاتی پیچیدگیوں اور زندگی کے جذباتی پہیلیوں کی طرف بلیغ اشارات ان کی عام خصوصیت ہے۔ حیات اور کائنات کے ساتھ شدید یگانگت کا احساس ہم آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں ہم کو نرمی بھی ملتی ہے اور آفاقی تاثر بھی، اسلوبِ بیان میں ایک پختہ گھلاوٹ ہے جو بالکل ان کی اپنی چیز ہے۔"

رسالہ ساقی دہلی بابت فروری ۱۹۴۲ء میں فراق کی ایک تازہ ترین غزل کفریات کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

شعلے لپکتے ہیں مقتل میں زعمِ شہادت کی یہ گرمی
ڈری ڈری سی حیات بھی ہے، موت بھی ہے کچھ سہمی سہمی

میرے اور تیرے ملتے ہی جیسے بجلی ٹوٹ پڑے
عشق کی دنیا لرزاں لرزاں حسن کی دنیا سہمی سہمی

گلزاروں کا بھرم کھل جائے، اس کا کافر جسم تو دیکھ
شبنم اور شعلے میں بھی کہاں ہے اتنی ٹھنڈک اتنی گرمی

پرسشِ غم کرتی ہوئی آنکھیں دیتی ہیں پیام اجل
یہ دلجوئی، یہ بیدردی، یہ ہمدردی، یہ بے رحمی

مان کے بھی جو بات نہ مانے، مل کے بھی جو آئے نہ ہاتھ
کتنی نرم ہے اس کی طبیعت اس پر یہ ضد یہ ہٹ دھرمی



مُلّاؔ

پنڈت آنند نرائن نام، مُلّاؔ تخلّص، ولد پنڈت جگت نرائن مُلّا آنجہانی کشمیری برہمن، پیدائش ۱۹۰۱ء۔ ان کے دادا نے لکھنؤ میں تربیت پائی، اور اس کے بعد ان کا خاندان مستقل طور پر لکھنؤ میں آباد ہو گیا۔ مُلّاؔ بچپن ہی سے بہت ذہین اور طبّاع ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم جوبلی گورنمنٹ ہائی اسکول لکھنؤ میں ہوئی اور بعدہٗ کیننگ کالج میں تعلیم پاتے رہے ۱۹۲۵ء میں ام اے، ال ال بی، پاس کر کے تعلیم سے فارغ ہوئے، اور اب لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں۔

اردو اور فارسی مسٹر مُلّاؔ نے مولانا محمد برکت اللہ صاحب رضاؔ مرحوم فرنگی محلی سے پڑھی، مولانا مرحوم ایک پُرگو شاعر تھے۔ عجب نہیں کہ ان کے فیضِ صحبت سے مسٹر مُلّاؔ نے شعر و شاعری کے ابتدائی اسباق حاصل کئے ہوں۔ ان کے علاوہ مسٹر مُلّاؔ کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت منوہر لال زتشی تھے، جن کا ادبی ذوق اس صوبہ میں مشہور رہی۔ اُن سے بھی مسٹر مُلّاؔ نے استفادہ کیا، اور نظمیں کہنے لگے۔ انھوں نے بھی کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا، اس دور کے ایک نہایت خوش فکر اور رنگین بیان شاعر ہیں، ادب اردو کا مطالعہ وسیع ہو اور گوشتہ کی مصروفیت کی وجہ سے وقت کم ملتا ہو، لیکن اردو شاعری سے ان کو اس قدر گہرا لگاؤ ہو کہ مشقِ سخن برابر جاری ہو۔ ان کا کلام ملاحظہ ہو ؎

"تم"

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن چکا ہو مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

تمھیں خیال کی تنہائیوں میں دیکھا ہو۔

تمھیں اُمید کی رعنائیوں میں دیکھا ہے
جدھر بھی آنکھ اُٹھی ہے فروغِ بام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

اُفقِ حیات کا پھر بھی تمھیں سے ہو رنگیں
ہر ایک بزمِ تصوّر تمھیں سے ہو زرّیں
تمھارے سمت ہے دل کی نگاہِ بازپسیں
اندھیری زیست کی اک زرنگار شام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

"جہاں میں ہوں"

تمنا قید، ہمّت پا بجولاں ہو جہاں میں ہوں
مجھے جکڑے ہوئے زنجیرِ امکاں ہو جہاں میں ہوں
کبھی شاید فرشتہ آدمِ خاکی بھی بن جائے
ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہو جہاں میں ہوں
وہی رُوئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہو جہاں میں ہوں
نظر میں ہیں تصوّر کے وہی موہوم نظارے
ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہو جہاں میں ہوں

غزل

جفا صیّاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی
قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی
یہ دل کیا ہو کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا

تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

بھرم حُسنِ حقیقت کا کوئی کھُلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی تجلّی درمیاں کر دی

بہم رہِ طلب میں مشکل کا سامنا ہے — ہر گام پہ فریبِ منزل کا سامنا ہے
ہُشیار حسنِ حیرت ارمان بن چلی ہے — پہلے فقط نظر تھی اب دل کا سامنا ہے

ترانۂ گنہگار

لذتِ درد کون دے لطفِ وصال کے لئے — میں نے تو چھوڑ دی بہشت تابِ خیال کے لئے
روح مری ہے مضطرب اپنے جمال کے لئے — جلوۂ دو جہاں ہے کم چشمِ سوال کے لئے
آرزوئے کلیم کی دہر میں یادگار ہوں

دوشیزہ کا راز

بےخبر فطرت سے اپنی خاطرِ معصوم تھی — یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی
آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی — کوئی لذّت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی
اب حقیقت زیست کی مجھ پر ہویدا ہو گئی
کل تلک انگور تھی جو آج صہبا ہو گئی

کل بھی دل سینہ میں تھا پر یہ دلِ نرجیں نہ تھا — کل تلک بطنِ صدف میں یہ دُرِ مکنوں نہ تھا
کل بھی تھا مجھ کو مذاقِ زیست لیکن یوں نہ تھا — کوئی جادو تھا، پیامِ دیدۂ مجنوں نہ تھا
دل میں ہوک اُٹھی لبوں پر مسکراہٹ آ گئی
رُخ پہ رنگ آیا، نگاہوں میں لگاوٹ آ گئی

ساغر ملاّ دورِ حاضر کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے نقاد ایک ذی مرتبہ ادیب اور سخن سنج ہیں۔ ان کے کلام میں جذبات عالیہ کی دلکشی

تراکیب کی شوکت اور اثر آفرینی موجود ہے، ہمیں اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں ان کو شعراء کی صفِ اول میں جگہ مل جائے گی۔

ان کی غزل کے اشعار میں درد و اثر ہے، جذبات میں بلندی، بندش میں چُستی بدرجہ اتم موجود ہے، یہی حال ان کی نظموں کا بھی ہے، ان کی اکثر و بیشتر نظمیں کیفیات میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں، سادہ الفاظ میں دقیق خیالات، دلکش تشبیہات اور پُر لطف استعارے ان کی نظم کو اور زیادہ بلند اور پاکیزہ بنا دیتے ہیں آپ نا اُمیدی اور مایوسی کے قائل نہیں بلکہ قوت مقابلہ کے دوش بدوش کھڑے ہو کر ہر سانحہ کا مقابلہ کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ کا شمار عہد حاضر کے بہترین شعراء میں ہے۔ آپ کا یہ شعر تا قیامت لوگوں کی زبان پر رہے۔

وقت بھی ہے عجیب چیز   تم مجھے بھول جاؤ گے

ہندوستان کے چار مشہور نقاد کی تنقیدیں ملاؔ کے کلام پر ملاحظہ ہوں

پروفیسر کلیم الدین احمدؔ لکھتے ہیں۔

" غزلیت حفیظ سے زیادہ ہے، زبان میں نرمی بھی ہے اور شوخی و صفائی بھی۔ ابتذال اور فرسودگی سے پرہیز کرتے ہیں لیکن جدت مفقود ہے۔"

پروفیسر آل احمدؔ سرور کا خیال ہے۔

" ملاؔ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم لکھنویت اب لکھنؤ میں ختم ہو رہی ہے، ابھی ان کے کلام میں انوکھا پن تو نہیں آیا، مگر بعض اشعار میں وہ انفرادیت اور مخصوص تجربات کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔"

پروفیسر مجنوں لکھتے ہیں۔

"جذبات کا توازن، زبان کی سنجیدگی و سلاست ان کی نمایاں خصوصیت ہے، ان میں نہایت صالح قسم کا ذوقِ تغزل پایا جاتا ہے۔"

پروفیسر تاثیر کا خیال ہے۔
" اندرونی جذبات کے اظہار میں منفعلانہ انداز رکھتے ہیں۔
لیکن حقائق حیات کے متعلق کھلم کھلا بغاوت کا اعلان
کرتے ہیں۔"

قیسؔ

لالہ امرچند نام، قیسؔ تخلص، دراصل قصبۂ بسی کلاں ضلع ہوشیارپور کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد لالہ ہری رام مرحوم علاقہ کے ایک مشہور تاجر اور ساہوکار تھے، آپ کے آباؤ اجداد بجواڑہ سے جو عہد اکبری میں ایک مشہور و معروف شہر تھا موردِ عتابِ شاہی ہوکر بسی کلاں میں آباد ہوئے تھے۔

قیسؔ صاحب نے ابتدائی تعلیم مقامی پرائمری اسکول میں پائی، پھر وظیفہ حاصل کرکے سردار بہادر اس چند ہائی اسکول بجواڑہ میں داخل ہوئے ہیڈماسٹر صاحب کا خیال تھا کہ ایسا ذہین طالب علم آپ کی نظر سے نہیں گذرا، کبھی کتاب تک نہیں خریدی، لیکن نثر کی کتابیں بھی از خود حفظ ہوجایا کرتی تھیں، ان دنوں جب کبھی آپ اشعار کہا کرتے تو ماسٹر آپ کو سزا دیا کرتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم رندھیر کالج کپورتھلہ، فورمن کالج لاہور اور ڈی، اے، وی کالج جالندھر میں حاصل کی۔ بی، اے کا امتحان سناتن دھرم کالج لاہور سے دیکر روزنامہ "ملاپ" لاہور کے عملۂ ادارت میں شامل ہوگئے، بیک وقت بہت سے اخبارات میں کام کرتے رہے ہیں، مختلف رسائل و جرائد میں آپ کے مضامین آگل، جاہل، دیش بھگت، ہندی وغیرہ بے شمار ناموں سے احترام کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں، زمانۂ طالب علمی میں علمی مباحثوں مناظروں اور مشاعروں میں انعامات اور تمغہ جات حاصل کرتے رہے، سناتن دھرم کالج لاہور میں آپ ادبی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کی روحِ رواں سمجھے جاتے۔ چنانچہ بزمِ ادب اور کالج میگزین کی تمام کامیابیاں آپ کی کوششوں ہی کی شرمندۂ احسان تھیں۔

آپ کے والدین کا مصمم ارادہ تھا کہ مزید اعلیٰ تعلیم نیز قانون کی تعلیم

کے لئے آپ کو ولایت بھیجا جائے، لیکن آپ نے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس تعلیم کا مقصد ملازمت کے سوا اور کچھ نہ تھا، قیس صاحب چونکہ قدرت کی طرف سے ایک خاص دل لیکر آئے تھے، اس لئے آپ کی آزاد فطرت کسی قسم کی پابندی کی متحمل نہ ہو سکی، تعلیم اور ملازمت دونوں کو خیرباد کہکر اپنے وطن مالوف آ گئے۔ جہاں کہ لوہا پرچہ اور ٹھیکہ وغیرہ کا کاروبار تھا، آپ گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے، اس دوران میں بہت سی قابل رشک ملازمتوں کی پیشکش ہوئی مگر آپنے پروانہ کی۔

نومبر [illegible]ء سے آپنے ظاہری دُنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا، اور گھر پر مطالعہ میں بجد مشغول رہے، ۲۶ دسمبر [illegible]ء کو مثنوی مولانا روم پڑھ رہے تھے کہ نکشاف حقیقت ہو گیا، اب مستانہ وار گلی کوچوں میں وعظ کرتے اور اشعار پڑھتے رہتے تھے۔

جناب قیس ابو المعانی مولانا محمد علی صاحب آذر جالندھری کے شاگرد رشید ہیں، اردو فارسی ہندی سب کچھ لکھتے ہیں، اور فی البدیہہ لکھتے ہیں، تین سال تک مشورہ دینے کے بعد استاد نے آپ کو لکھ دیا کہ اب اصلاح کی گنجائش نہیں اپنا کلام خود ہی دیکھ لیا کرو۔

قیس صاحب کو ادبیات کی ہر صنف پر عبور حاصل ہے آپ ایک زبردست ادیب اور نقاد بھی ہیں، "جذبات قیس" جو آپ کی ابتدائی غزلیات کا مجموعہ ہے، تیرہ سال ہوئے زمانۂ طالب علمی میں شائع ہوا تھا، "فلسفۂ گیتا" بھی انہی دنوں کا یادگار ہے، مختصر ڈراموں کا مجموعہ "آنسو" پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے، دو درجن کے قریب کتابیں لکھ چکے ہیں، جن کی اشاعت کا انتظام ہو رہا ہے، ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

"پیت کے گیت" اور "گیت ساگر" (گیتوں کے دو مجموعے)

"رسول درشن" (اردو اور فارسی نعتوں کا مجموعہ)

"امرت سنگی" (حالات سود و مہوں کا مجموعہ)

"کنول پھول" (کہانیاں)

"عورت کا دل" (ناول)

"مدوجزر ہند" (ایک سیاسی نظم)

"شعلہ زار" (راجستان منظوم)

"سجدہ" (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)

"اپریل فول اور دوسرے افسانے" (ظرلفیانہ کہانیوں کا مجموعہ وغیرہ وغیرہ)

فیض صاحب ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ سناتن دھرمی عقیدے کے مالک ہیں۔ تمام مذاہب کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، آپ کا ایمان ہے کہ ہر شخص کو اس کے اپنے عقیدہ سے نجات حاصل ہو جاتی ہے، شاگردوں میں ساگر، نسیم جالندھری، اختر ہوشیارپوری، نشتر جالندھری خاص شہرت کے مالک ہیں، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

سب سے پہلے آپنے یہ شعر کہا تھا ؎

جا کر کسی کی بزم میں آیا نہ جائے گا ۔ اُٹھوں گا میں تو دل کو اُٹھایا نہ جائے گا

غزلیں

ہر شے میں مجھے کل کا تماشا نظر آیا ۔ قطرہ لئے آغوش میں دریا نظر آیا

تھی شوخ نگاہی کسی ظالم کی قیامت ۔ جذبات کا عالم تہ و بالا نظر آیا

جب آنکھ کھُلی وہم بھی تھا اصل سراسر ۔ جب راز کھلا اصل بھی دھوکا نظر آیا

پہلو میں جو تھا دل تو فقط خون کا قطرہ ۔ آنکھوں میں پہنچا تھا کہ دریا نظر آیا

جب ہوش نہ آیا تھا پرایا بھی تھا اپنا ۔ ہوش آیا تو اپنا بھی پرایا نظر آیا

اس بزم میں اللہ رے حیرت کا یہ عالم ۔ پردہ کے نہ ہونے پہ بھی پردا نظر آیا

حُسن کا منظر بھی ہوتا ہے غضب کا رہبار
ایک گُل کو دیکھ کر نظریں گلستاں ہو گئیں

دشمنوں کو دے لیے ہیں آپ آنکھوں میں جگہ
اب نگاہیں لطف کی اس درجہ ارزاں ہو گئیں

اک جفا جو کو جفاؤں سے پشیماں دیکھ کر
میں تو میں میری وفائیں بھی پشیماں ہو گئیں

جن نگاہوں سے ٹپکتی تھیں کبھی معصومیاں
دیکھتے ہی دیکھتے وہ فتنہ ساماں ہو گئیں

مے فروش آنکھوں کو جس دم یاد کر لیتا ہوں میں
اک جہانِ بیخودی آباد کر لیتا ہوں میں

رنگ ایسا ضبط میں ایجاد کر لیتا ہوں میں
اپنی خاموشی ہی کو فریاد کر لیتا ہوں میں

اُن کی عادت ہے کہ مجھ کو بھول جاتے ہیں مگر
میری فطرت ہے کہ ان کو یاد کر لیتا ہوں میں

وہ ماہتاب میں ہے نہ ہے آفتاب میں
جو ضو جھلک رہی ہے کسی کے نقاب میں

پیشِ نظر ہے خواب کا منظر سا خواب میں
اے قیس ورنہ تو ہے نہ لیلیٰ نقاب میں

کیا پوچھتا ہے برقِ تجلّیِ نقاب کی
جلوے میں ہے نقاب کہ جلوہ نقاب میں

کھلتے ہی آنکھ کے یہ حقیقت بھی کھل گئی
جو تھا سرِ نقاب وہی ہے نقاب میں

میری نظر سے چھپ نہ سکا حُسن خود نقاب
میری نظر نے آگ لگا دی نقاب میں

خواہش کے باوجود نگاہیں نہ اُٹھ سکیں
وہ بے نقاب ہونے پہ بھی ہیں نقاب میں

اے شوقِ دید اتنا فریبِ گماں اُٹھے
وہ حسن بے نقاب ہے اب تک نقاب میں

دیدِ جمالِ یار کی طاقت ہی تھی کسے
اچھا ہوا کہ آپ رہے وہ نقاب میں

میری نگاہِ شوق پڑی جب نقاب پر
دیکھا بجز نقاب نہ تھا کچھ نقاب میں

کھل ہی سکا نہ رازِ طلسمِ نگاہ سے
وہ خود نقاب میں ہیں کہ میں خود نقاب میں

آنکھوں سے اب نقاب اُٹھا دینا اے قیس
لیلیٰ بھی ہو سکے گی مقیّد نقاب میں

جی جی کے مر گئے کبھی مر مر کے جی اُٹھے
کیا معجزہ دکھایا ترے انتظار نے

لطفِ خیال، کیفِ تصوّر، نشاطِ یاد
کیا کیا نہیں دیا کسی غفلت شعار نے

کیا کم ہو کہ کن سے کہ غم کی پہاڑ رات
آنکھوں میں کاٹ دی ترے اختر شمار نے

نازک کلائی، نرم طبیعت، ذرا سا دل
آئے ہو میرے سینے میں خنجر اُتارنے

برباد کردیا مجھے برباد کردیا
اس دل نے ہاں اسی دلِ اُلفت شعار نے

کیا خبر عشق سے مُراد ہو کیا،
مضطرب دل ضرور رہتا ہو

عشق میں اور کچھ رہے نہ رہے
عقل میں کچھ فتور رہتا ہو

قیس جب میکشی نہیں کرتا
پھر اسے کیوں سرور رہتا ہو

رقّاصہ

نگاہِ مست سے سرمستیاں بہاتی ہو

ملا رہی ہو تو جھنکاریاں ترنم میں
لٹا رہی ہو گل و لعل و زر تکلم میں

ہنسی ہنسی ہی میں کیا بجلیاں گراتی ہو

اللہ رے شوقِ دید کی سحر آفرینیاں
گوشہ اُلٹ رہا ہو کسی کے نقاب کا

ہندوستانی گیت

میرا جیون

ساجن تو جیون ہو میرا
تجھ سے چاروں کونٹ اُجالا
تجھ بن گھور اندھیرا
ساجن تو جیون ہو میرا

چرنوں کی داسی

ساجن میں چرنوں کی داسی
میں چرنوں کی داسی اور تو
من مندر کا باسی
ساجن میں چرنوں کی داسی

تجھ بن دن ہو رین بھیانک
تجھ سے سانجھ سویرا
ساجن تو جیون ہو میرا
کال بُلاوا، تیری دُوری
اوت درشن تیرا
ساجن تو جیون ہو میرا

درشن جل کو رو بیٹھی ہیں
میری اکھیاں پیاسی
ساجن میں چرنوں کی داسی
تو آئے تو شاید جائیں
چنتا سوچ اُداسی
ساجن میں چرنوں کی داسی

ہندوستانی دوہے

(۱)
میں بنسی کی نیائیں ہوں ساجن کرشن سمان
ان بن خالی خول ہوں ان سے مجھ میں پران

(۲)
تن پر تو باقی نہیں اب ماس بھی ماس
پر من سے جاتی نہیں پیا ملن کی آس

(۳)
ندی کنارے پر کھڑا کرتا ہو کیا سَیر
چل ٹھاٹھوں میں یہ ذرا منجدھاروں میں تیر

(۴)
بڑی درستا ٹور گکی بھلا نرک کا راج
بھیک انت کو بھیک ہو تاج انت کو تاج

قیس صاحب کے کلام میں سوز و گداز کے اثرات بدرجہ اتم موجود ہیں، ان کے قلب کے درد کی کیفیت ان کے اشعار سے پوری طرح ظاہر ہو۔ شراب معرفت کی چاشنی سے ان کا کلام درد ہن خوب مانوس معلوم ہوتا ہو۔

رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت بڑی عقیدت اور جوش و خروش کے ساتھ لکھتے ہیں، جس سے ان کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ حکیم رومیؒ کی تعلیم ان کے دل پر مرتسم ہے، اس دور کے ایک باخبر صوفی، ایک برگزیدہ فقیر منش اہل دل ہیں، ان کے قلم سے جو کچھ نکلتا ہے سامعین و ناظرین کے دلوں پر ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔

فرحت

گنگا دھر نام، فرحت تخلص، وطن کان پور ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار بابو بشمبر ناتھ صاحب آنجہانی کے زیرسایہ حاصل کی۔ بی، اے، آپنے ڈی، اے، وی کالج کانپور سے پاس کیا اور ال، ال، بی، کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی، آجکل کانپور میں وکالت کرتے ہیں، اور اپنے اس پیشہ میں بہت کامیاب ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں آپنے تحریک ترک موالات میں حصہ لیا اور دو سال کے لئے اپنی تعلیم قطعًا چھوڑ دی تھی جس سے آپ کو سخت نقصان پہنچا، اس کے بعد سے آپ ایک خاموش کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے، مگر ۱۹۳۱ء آپ کا جذبۂ حب الوطنی پھر جوش پر آیا، اور اسی سنہ میں اپنی تعلیم دو سال کے لئے پھر چھوڑ دی سٹی کانگریس کمیٹی کانپور کے آپ جنرل سکریٹری تھے، اسی سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور چھ ماہ کی سزا کاٹی، شعر و شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے تھا، آپنے حضرت احسن سنبھلی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ مگر صرف آٹھ یا دس غزلوں پر اور وہ بھی اس طرح کہ آپ کے استاد آپ کی غزلوں کو درست نہ کرتے تھے بلکہ غزلوں پر وہ تنقید کرتے تھے اور پھر آپ سے کہتے تھے کہ اصلاح کرو۔ چنانچہ آپ خود اپنی غزلوں پر دو دو اور تین تین بار اصلاح دیا کرتے تھے۔ اس طرح چند روز کے بعد ہی آپ کے استاد مرحوم نے فرمایا کہ اب اصلاح کی ضرورت نہیں رہی، اردو ادب کی ترویج اور اشاعت میں آپ دل و جان سے کوشاں ہیں، چنانچہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی دوسری کل ہند اردو کانفرنس کانپور میں آپ ہی کی بدولت ہوئی تھی۔ عصر حاضر کے آپ اچھے شعراء میں ہیں۔ اور اشعار خوب کہتے ہیں۔ کلام میں روانی ہے۔ شگفتگی جگہ جگہ عیاں ہے۔ کئی ہزار اشعا

آپ نے کہے ہیں، جن کی تدوین کر رہے ہیں، تاکہ ان کی اشاعت کی جا سکے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ۔

ذلّت کو مستعار کہتے ہیں ‏ زندگی کو غبار کہتے ہیں

اصل میں ہیں وہی بلند مقام ‏ خود کو جو خاکسار کہتے ہیں

ان کی نادانیوں کا کیا کہنا ‏ دل کو جو ہوشیار کہتے ہیں

یہ تجاہل ہے ان کا یا شوخی ‏ ضبطِ غم کو غبار کہتے ہیں

لوگ دنیائے عشق میں مجھ کو ‏ فرحتِ جاں نثار کہتے ہیں

عین ہستی ہے مجھ کو اے فرحت
جس کو سب انتظار کہتے ہیں

تیرے کرم نے تیری عنایات نے مجھے ‏ دنیا میں آج یوسفِ ثانی بنا دیا

میرے جنونِ عشق و جبینِ نیاز نے ‏ تجھ کو جہانِ شوق کی رانی بنا دیا

بے التفاتیِ نگہِ یار نے مجھے ‏ آئینۂ جنون و جوانی بنا دیا

فرحت صرف غزل گو ہی نہیں ہیں بلکہ نظم گو بھی ہیں، ان کی ایک تازہ ترین نظم ساقی دہلی بابت فروری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی ہے، وہ درج ذیل ہے

سلامِ شوق

خلوصِ غم کی وفائیں سلام کہتی ہیں ‏ وفورِ شوق کی آہیں سلام کہتی ہیں

تمھیں چمن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں ‏ کسی غریب کی آہیں سلام کہتی ہیں

حجابِ حسن کا جن پر کہ رعب طاری ہے ‏ وہ سہمی سہمی نگاہیں سلام کہتی ہیں

جو راز دارِ کرم ہیں امینِ درد بھی ہیں ‏ وہ بہکی بہکی نگاہیں سلام کہتی ہیں

جنھیں نیازِ جمال و کمال ناز نہیں ‏ وہ بے نیاز وفائیں سلام کہتی ہیں

نگاہِ غیر سے جو راز بن کے رہ نہ سکیں ‏ وہ بے پناہ نگاہیں سلام کہتی ہیں

جنھوں نے تم پہ نچھاور کیئے ہیں دونوں جہاں — وہ پُرخلوص وفائیں سلام کہتی ہیں
میں بے زبان و متین و خلیق و سنجیدہ — مری خموش نگاہیں سلام کہتی ہیں
تمہاری چشمِ کرم آشنا کو جھک جھک کر — میری حسین خطائیں سلام کہتی ہیں
مرے کمالِ وفا کا ہو ایک یہ بھی کمال — مجھے تمہاری جفائیں سلام کہتی ہیں
یہ رعبِ حسن ہو یا احترامِ حسن و جمال — کہ جھک کے میری نگاہیں سلام کہتی ہیں
کبھی ادھر بھی نگاہِ کرم ز راہِ کرم — دلِ غریب کی آہیں سلام کہتی ہیں
وہ جن سے ہو مری ہستی کو اعترافِ حیات — وہ صبر سوز جفائیں سلام کہتی ہیں
جو ضبطِ عشق کو دیتی ہیں درسِ بیتابی — وہ نرم نرم ہوائیں سلام کہتی ہیں
وہ جن سے ملتا ہو زاہد کو اذنِ میخواری — وہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں
نہ جنھیں کیفِ تبسم، نہ خندۂ شیریں — وہ سونی سونی صدائیں سلام کہتی ہیں
جو گھیرے رہتی ہیں فرحت کو ہجر میں اکثر — وہ کالی کالی بلائیں سلام کہتی ہیں

ان کی ایک اور نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

یہ مری خواہش نہیں تو بخش دے میرے گناہ — ہاں مگر توفیقِ خمیازہ بھی اے معبود دے
یہ مری خواہش نہیں ناکامیاں مجھ تک نہ آئیں — ہاں مگر کچھ قوتِ برداشت اے مسجود دے

یہ نہیں خواہش کہ مل جائے سکونِ جاوداں — ہاں مگر موجِ حوادث پہ بھی قابو بھی دے
یہ نہیں خواہش کہ بے تاثیر ہو جذب و کشش — پھر بھی مقناطیس سے کھنچنے کی مجھ کو خو بھی دے

یہ نہیں خواہش کہ مایوسی کے بادل چھا نہ جائیں — چھائیں لیکن میری آنکھوں سے برسنے ہی نہ پائیں
اور اگر برسیں تو برسیں پھر برس کر کھل نہ جائیں — خود امیدیں مطلعِ شفاف پہ پھر مسکرائیں

اے مرے مالک! مرے ہر اک گنہ کی دے سزا
بارگاہِ عینِ رحمت میں مرا سر مست جھکا

صرف فتح و کامیابی ہی نہ تو محسوس ہو　　ہاں شکستِ آرزو میں بھی ہو تجھ پر اعتماد
جس جگہ ہلنے لگے ایمان کی بنیاد و بیخ　　اس جگہ ہو لے نہ کفرِ مستقل پر اعتقاد

میری سعیِ مستقل ناکام ہو یا کامراں　　جہد و جہدِ زیست میں محرومیاں پیدا نہ ہوں
منزلِ مقصود پانے کی نہیں کرتا دعا　　سعیِ پیہم سے مگر مایوسیاں پیدا نہ ہوں

یہ نہیں خواہش کہ پاؤں دولت و مال و منال　　یہ نہیں خواہش کہ بڑھ جائے مرا جاہ و جلال
خسروی و قیصری کا ذکر وجہِ ننگ ہے　　ہاں مگر پھیلے نہ دنیا میں مرا دستِ سوال

اے مرے معبود میرے ہر گنہ کی دے سزا
فرحتِ ناچیز کا سر معذرت میں مت جھکا

فرحت کانپوری نے رباعیاں بھی خوب لکھی ہیں اور حقائق روزگار کو بخوبی نظم کیا ہے، ان کی چند رباعیاں بھی ملاحظہ ہوں ؎

اپنی قیمت گہر کو معلوم نہیں　　قدر رسا یہ شجر کو معلوم نہیں
سجدہ کرنے کو ہیں فرشتے تیار　　اپنی عظمت بشر کو معلوم نہیں

اعمال سے اپنے ڈر نہیں سکتا ہوں　　مرنا چاہوں تو مر نہیں سکتا ہوں
تادیبِ ضمیر سے ہوں فرحت مجبور　　چاہوں تو گناہ کر نہیں سکتا ہوں

یہ راہ بھی مسدود ہوئی جاتی ہے　　یہ جنس بھی مفقود ہوئی جاتی ہے
بتخانہ و کعبہ کی نمائش بے سود　　ہستی مری معبود ہوئی جاتی ہے

رسوا آیا ہوں خوار آیا ہوں　　درگاہ میں تیری شرمسار آیا ہوں
اپنی رحمت کی لاج رکھ لے مالک　　ہر چند کہ میں گنہگار آیا ہوں

مدہوش

سنت پرشاد نام، مدہوش تخلص، ۱۹۰۶ء میں بمقام باندہ (یو پی) پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام رائے صاحب بابو گنیش پرشاد ہے، جو باندہ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے چیرمین تھے، یہ قوم کے کالستھ ہیں اور ان کا خاندان باندہ میں وجاہت اور عزت کے لئے مشہور ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول باندہ میں ہوئی۔ بی، اے الہ آباد اور ایم، اے آگرہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے۔ اور اپریل ۱۹۳۷ء میں تقدس مآب صاحب جی مہاراج نے ان کو رادھا سوامی سنگت کا سکریٹری مقرر کیا۔ آجکل دیال باغ انٹرمیڈیٹ کالج اور پریم ودیالہ ڈگری کالج میں اقتصادیات کے شعبہ کے صدر ہیں۔

مدہوش صاحب کو شروع سے فلسفہ اور دینیات سے غیر معمولی دلچسپی ہے عربی میں استعداد حاصل کی کہ قرآن شریف پڑھ سکیں، سنسکرت میں عبور حاصل کیا کہ وید اور گیتا کا مطالعہ کر سکیں۔ فارسی میں پوری دستگاہ رکھتے ہیں اور مثنوی مولانا روم رحمۃ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ مدت سے شکوک و توہمات کے بھنور میں غوطہ زن ہیں۔ دینیات و فلسفہ کا مطالعہ اس امید میں کہ کسی طرح ظلمت کے پردے دور ہوں، خود فرماتے ہیں ؎

تدبیر پریشاں ہے، تقدیر ہے شرمائی　　مغرور مسیحا ہیں، نالاں ہے مسیحائی
انساں سگِ دنیا ہے، دنیا کا تمنائی　　دارو ئے نجات اس کو آتی ہے نہ راس آئی
رہوارِ تمنا ہے، گرتا ہے، پھر اٹھتا ہے　　صحرائے تناسخ ہے اور بادیہ پیمائی
مدہوش ہے شرمندہ کھوئی ہوئی عظمت پہ　　مسجودِ ملائک کی یہ ناصیہ فرسائی

ان کے اور ان کے کلام کے بارے میں اڈیٹر زمانہ فرماتے ہیں

"مدہوش صاحب اردو ہندی کے علاوہ انگریزی اور فارسی ادب میں بھی کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ تصوف سے آپ کو اتنا شغف ہے کہ ہر وقت نانک، کبیر، سرمدؒ، حافظؒ، شمس تبریزؒ اور مولانا رومؒ وغیرہ صوفیائے کرام کا کلام آپکے زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ مثنوی مولانا رومؒ کے تو آپ فاضل کامل ہیں۔ جس ذوقِ سلیم و ادبی تحقیق کے ساتھ آپنے مثنوی کو بار بار پڑھا ہے، اس کی مثال آپ کے معاصرین میں شاذ و نادر ہی ملے گی۔ بہر حال اسی تحقیق اور مطالعہ کی برکت ہے کہ آپ کے کلام میں انسانیت اور روحانیت بھری ہوتی ہے۔ حضرت مدہوش کی شاعری کا انداز محض عاشقانہ نہیں، بلکہ والہانہ ہوتا ہے۔ وہ شاید ہی کبھی قصداً شعر کہنے کے لئے بیٹھتے ہوں، بلکہ جب ان کے قلب پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، یا ان کے دلِ دردمند پر کوئی چوٹ لگتی ہے تو ان کے جذبات خود بخود اشعار بن جاتے ہیں، اسی لئے ان کے کلام میں وہ سب خصوصیات موجود رہتی ہیں جنھیں مشہور نقادِ سخن حضرت فراقؔ سپردگی خستگی اور گداز سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت مدہوش واقعاتِ زیست کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔"

غزلیات

عشق کی رَو میں کچھ اسطرح سے بہہ جاتے ہیں
جو کہ کہنا نہ ہمیں چاہئے کہہ جاتے ہیں

اور جب کہنے کی ہو بات تو اُن کے آگے
دل کو ہم تھام کے خاموش ہو رہ جاتے ہیں

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتے رُکتے
حُسن توفیق جو دیتا ہے تو کہہ جاتے ہیں

حُسن سے سب پہ گرانی تھی بقولِ شاعر
ناتواں عشق کے اس بار کو سہہ جاتے ہیں

بات پردہ کی ہے جو حضرتِ مدہوش ویسے
پردۂ شعر میں کس لطف سے کہہ جاتے ہیں

شیشۂ دل کو کسی سنگ سے ٹکراؤں کہیں
خود کو بھی پاؤں نہ اس سطح سے کھو جاؤں کہیں

ہیں غمِ عشق پہ حاوی کے غمِ دوراں کے لگے
اور جیے کے نہ غمِ عشق کے اب کھاؤں کہیں

کھل گیا سارا بھرم عشق کی مستی کا
دل مگر کہتا ہے اب بھی اسے بھرماؤں کہیں

حسن کا ساز تو ہوتا ہے بڑا خواب آور
اس کو اس ساز میں لیجا کے سلا آؤں کہیں

آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی ہے شبِ غم کتنی
تھپکیاں اب بھی نہ دے حسن تو مر جاؤں کہیں

رشک آتا ہے مجھے ان پہ جو ہیں اہلِ جمود
دل کو پھینک آؤں کہیں عشق کو ٹھکراؤں کہیں

سانس لیتا ہوں تو آتا ہے کلیجہ منہ کو
ایسے جینے سے تو مدہوش ہی مر جاؤں کہیں

عشق بلند آہنگ

رو رہا ہے شاہدِ آفاق آنسو خون کے
حسن خطِ انفرادی کی ہنسی اچھی نہیں

چھوڑ دو عشاق کو دنیا بدلنے کے لئے
اس زمانے میں حسینوں دل لگی اچھی نہیں

حسنِ عالمگیر ہے یہ اجتماعی زندگی
جگمگا دو انفرادی زندگی اچھی نہیں

حسن سے کہہ دو کہ میدانِ عمل ہے منتظر
عشق کو توفیق دے یہ بے بسی اچھی نہیں

وسعتِ صحرائے عالم کا تقاضا دیکھئے
قیس کی سی زندگی مرکزی اچھی نہیں

حسن جو خود بیں ہے اُس پر کیوں گمانِ حسن ہو
عشق کے نزدیک تو کم مائگی اچھی نہیں

جو طلبگارِ جبری وہ شیر مردِ عشق ہے
ہو وہی حسنِ حقیقی بزدلی اچھی نہیں

شیر مردی عشق کی ہو مشتمل ہر دور پر
دردمندانِ محبت! بے حسی اچھی نہیں

حسن عالمگیر ہو صبر آزما جرأت شکن
اے تنگ ظرفو! تمہاری مسکنی اچھی نہیں

موج مے ہے یا کہ کوثر آفریں دل کی ترنگ
جو خمار آور ہو وہ تو سرخوشی اچھی نہیں

اس سے ٹکرانا ہو اپنا شیشۂ ہستی ہمیں
تلخیِ مینائے نیلی فام کی اچھی نہیں

عشق بازانِ مہم پیشہ کے آگے کانپ اٹھیں
مشکلوں کے حق میں انکی کپکپی اچھی نہیں

رند کہتے ہیں کہ آجائے یہ راہِ راست پر
لغزشیں یہ وقت کے رفتار کی اچھی نہیں

ناتوانِ عشق ہو مدہوش پڑا ہو آسماں
ناتوانِ عشق کی یہ ٹھوکر بھی اچھی نہیں

شانِ مے نوشی

حضورِ پیرِ مغاں سے ملی ہو مدہوشی
ادائے مست سے کرتے ہیں رندِ مے نوشی

شراب خانۂ ہستی میں دورِ عیش کہاں
ہماری بادہ پرستی ہو یا کہ غم نوشی

فنا کے شیشے سے ٹکرا رہے ہیں جامِ حیات
ارے یہ بادۂ ذوقِ فنا کی سرجوشی

بہت ہی تند جو ہو ساقیِ اجل کی شراب
تو رند بھی تو ہیں خو کردۂ بلانوشی

اُٹھا کے شیشۂ ہستی پٹک دیا مدہوش
نہ چھوڑی شیشہ شکن تو نے شانِ مے نوشی

مری زندگی میں وہ نغمے نہیں ہیں
کہ جو سازِ خوابِ آورِ زندگی ہوں

مرے مطلعِ زیست پر وہ ستارے
نہیں ہیں کہ جو تشکلِ تابندگی ہوں

جیا رائگاں پر وہ سانسیں نہیں لیں
کہ جو غم کشِ بارِ شرمندگی ہوں

تو خود داریوں کو بنا مشعلِ راہ
جو مدہوشِ وجدِ درخشندگی ہوں

دامنِ زیست پہ غم کا رہا نکھرا ہوا رنگ
دیکھ لو اس میں خوشی کا تو کوئی داغ نہیں

شرابِ عشق

خود اپنے شیشۂ دل کی ملا کے پیتا ہوں
میں دلبروں کے دلوں میں سما کے پیتا ہوں

وہ بادہ نوش ہوں پہلے پلا کے پیتا ہوں
لبوں کو اُسکے لبوں سے ملا کے پیتا ہوں

میں آگ خانۂ دل میں لگا کے پیتا ہوں
شرابِ عشق سے شعلے اُٹھا کے پیتا ہوں

تڑپ کے چیخ کے اور تلملا کے پیتا ہوں
شراب خانہ میں محشر اُٹھا کے پیتا ہوں

ہوئے حرام بطِ مے میں کر کے اُسکو حلال
شرابِ عشق کو مذہب بنا کے پیتا ہوں

خدا کے نام سے چھوڑی تھی میکشی میں نے
اُسی کے نام سے ساغر اُٹھا کے پیتا ہوں

رُباعیات

(۱)

بندہ ہوں ادا نماز کرتا ہوں میں
اک فرض سے اپنے ساز کرتا ہوں میں
دے کچھ نہ مجھے وہ دینے والا مدہوش
پر دستِ طلب دراز کرتا ہوں میں

(۲)

ہو طالبِ رب تو سب ہی کھو جانے دے
دُنیا کی طلب کا ہاتھ سو جانے دے
مدہوش ضرور چشمِ دل وا ہو گی
تو چشمِ ہوس کو کور ہو جانے دے

(۳)

نقاشِ جہاں! یہ عکس فانی کیا ہے
شبنم کا فریب، درفشانی کیا ہے
پھولوں کی ہنسی ہے، شادمانی کیا ہے
پانی کا اُبال ہے، جوانی کیا ہے

(۴)

مدہوش نے جامِ عیشِ ہستی توڑا
یعنی قدحِ شوقِ مے پرستی توڑا
ساقی کے بھی ہوش اُڑ گئے تو یہ
اس طرح طلسمِ کیف و مستی توڑا

(۵)

حل نہیں حل نہیں سازِ ہستی
عقدہ ہے کہ کھلتا نہیں رازِ ہستی
گھبرا اُٹھا دم توڑ کے بولا مدہوش
اُٹھتا نہیں اُٹھتا نہیں نازِ ہستی

(۶)

بیٹھے ہو اُداس اہلِ ظلمت صد حیف
ہوتے ہو نراس اہلِ ظلمت صد حیف
ظلمات کے آگے آبِ حیواں بھی ہے
ہو عاصی یاس اہلِ ظلمت صد حیف

یا بال عرش؟

عرش بال۔

عرش و فرش؟

بال نام، عرش تخلص، تاریخ ولادت ۲۰ ستمبر ۱۹۰۸ء، وطن قصبہ ملسیاں ضلع جالندھر صوبۂ پنجاب، والد کا نام پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی، شاگرد رشید فصیح الملک جہاں استاد حضرت داغ مرحوم، بقید حیات ہیں۔ رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور کے ایڈیٹر ہیں۔ مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ پنجاب انجینئرنگ کالج رسول سے اوورسیر کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمۂ نہر میں ۱۹۲۸ء میں ملازمت اختیار کی۔ شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی اور ادبی زندگی گذارنے کا شوق۔ یہ ملازمت چھوڑ دی اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول لدھیانہ میں بہ حیثیت معلم ملازمت اختیار کی۔ آجتک اسی جگہ مقیم ہیں۔ ایف، اے اور بی، اے کے امتحان پرائیوٹ طور پر اسی ملازمت کے دوران میں کامیابی سے پاس کئے۔

شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی۔ تلمذ کسی سے نہیں، ہاں یہ فیضان والد محترم ہی کا ہے کہ شعر کہنے کی صلاحیت جلا پاگئی، غزل اور نظم دونوں میں طبیعت کام کرتی ہے، مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ مختلف اخباروں اور جرائد میں گاہ بگاہ چھپتا رہتا ہے۔ شاعری پیشہ نہیں، بلکہ ایک تفریحی شغل ہے، شملہ، لاہور، دہلی، کراچی، علی گڑھ اور دیگر مقامات پر ہندوستان کے طول و عرض میں بڑے بڑے مشاعروں میں کامیابی حاصل کی ہے، مختلف انعام، طلائی و نقرئی تمغہ جات بھی حاصل کئے۔ سب سے زیادہ یہ کہ مشاہیر مثلاً جناب سائل، بیخود، قمر بدایونی، ثاقب لکھنوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، نوح ناروی، سیماب اکبرآبادی سے داد سخن لی ہے۔ نثر میں مضامین لکھنے کا شوق بھی ہے۔ "ہندی کے مسلمان شعراء" کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون رسالہ "رہنمائے تعلیم" میں بارہا اقساط میں

ثائع ہو چکا ہی، اور عنقریب کتابی صورت میں شائع ہو گا۔ افسانے بھی لکھے ہیں،
اریخی مضامین بھی زیرِ غور رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو سے ہمدردی ہی، اور
لدھیانہ میں اس انجمن کے قیام اور بقا میں خاصہ حصّہ لیا ہو۔

انتخاب کلام

ل کو سوجھی بھی تو کب چاکِ جنوں سینے کی — دامنِ ہوش میں جب وقت کوئی تار نہ تھا

کیا دل نے سجدہ اُسے ہر قدم پہ — جبیں ڈھونڈھتی ہی رہی آستانہ
جوانی، محبت، وفا، نا اُمیدی — یہ ہی مختصر سا ہمارا فسانہ

اُمیدوں پہ پھرا جاتا ہی پانی — ٹھہرائے دیدۂ تر کی روانی
دیا کیوں اسکو عشقِ جاودانی — جسے بخشی ہی تو نے عمرِ فانی

اُ. ٹرکہ جلو میں ترے چلتے ہیں ہزار و دل — میرے دلِ ویراں کو پری خانہ بنا دے
زسوزِ حقیقی ہی مجھے سوز عطا کر — تو شمعِ ازل ہی مجھے پروانہ بنا دے

اُمنگ ہی نہ شباب ہی، نہ بہار ہی، نہ شراب ہی
کہوں موت کو میں عذاب کیوں مجھے زندگی ہی عذاب ہی

اورق ورق پہ لکھا ہوا وہی درد و یاس کا ماجرا
نہیں جس میں بابِ اُمید کا مرے عشق کی وہ کتاب ہی

تمہارے تیر کو جو دل میں رکھ لیتے ہیں خوش ہو کر
جفائے آسماں کو وہ بلاکش کیا سمجھتے ہیں

ارادے جن کے طوفانی ہیں فطرت جن کی طوفانی
وہ کشتی کو کنارے کی طرف پھیرا نہیں کرتے

جنھیں گم گشتگی کے فیض سے ہے ہر قدم منزل
جنونِ شوق میں رہبر کی وہ پروا نہیں کرتے

عشق کا سوز کیا ہوا عشق کا ساز کیا ہوا
تو ہی بتا کہ اے جگر تیرا گداز کیا ہوا

آہ نہ بن، فغاں نہ بن، آگ نہ بن، دھواں نہ بن
سینے سے جو نکل گیا راز وہ راز کیا ہوا

تو اگر دل میں ایک بار آئے
عمر بھر کے لئے قرار آئے

آشیانہ ہی گلستاں میں نہیں
اب خزاں آئے یا بہار آئے

وہ نہ آئیں تو اے دمِ آخر
لب پہ نام اُن کا بار بار آئے

موت نے آسرا دیا بھی تو کب
جب مصیبت کے دن گذار آئے

یاس کہتی ہے کچھ، تمنا کچھ
کس کی باتوں پہ اعتبار آئے

یہ تو کچھ تلخ تھی مرے ساقی
اب جو آئے وہ خوشگوار آئے

اس کو تیرا پیام سمجھوں
موت اگر وقتِ انتظار آئے

عرشؔ وہ بیقراریاں نہ رہیں
دل کو اب کس طرح قرار آئے

زخمِ دل بھی دکھا کے دیکھ لیا
بس تمھیں آزما کے دیکھ لیا

داغِ دل سے بھی روشنی نہ ملی
یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لیا

شکوے ہی ملتے ہیں کیونکر آپ سے آپ
سامنے اُن کے جا کے دیکھ لیا

مژدہ اے حسرتِ دلِ پُرشوق — اُس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا
آبرو اور رکھی ہوئی پانی — اشکِ حسرت بہا کے دیکھ لیا
ترکِ اُلفت کے سُن لئے الزام — رازِ دل کو چھپا کے دیکھ لیا
جو نہ دیکھا تھا آج تک ہم نے — دل کی باتوں میں آ کے دیکھ لیا
کوئی اپنا نہیں یہاں اے عرشؔ — سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

صنم کدہ ہو کلیسا ہو دیر ہو کہ کنشت — یہ خوب کر نہیں سکتے اُسے عمل جو ہے زشت
یہ لافِ برہمن و شیخ زادگی کیسی — کوئی غرورِ نسب سے نہیں ہے نیک سرشت
خیالِ حور و قصور و مئے طہور نہ کر — اگر تو غور سے دیکھے تو زندگی ہے بہشت
ہیں ایک دل ہی میں تسکین و اضطراب نہاں — اسی کا نام ہے دوزخ اسی کا نام بہشت
یہ مسجد اور یہ مندر خدا کے گھر تو یہ — اور ان میں آ کے تو کرتا ہے آرزوئے بہشت
ترے فریب و ریا کے ہیں مقبرے گویا — یہ رکھ دیے ہیں جو چُن چُن کے تو نے سنگ و خشت
مجھے خطر ہے کہیں مات کھا نہ جائے نہ تو — بساطِ دہر میں ہر ہر قدم پہ تجھ کو ہے کشت

دلِ مُردہ کو پھر پیامِ بقا دے — مری موت کو زندگانی بنا دے

بچھڑ کر قافلے والوں سے یہ حالت ہوئی میری
کہ ہر آواز اب بانگِ درا معلوم ہوتی ہے
تصنع کی فسوں کاری کا کچھ ایسا اثر دیکھا
کہ یہ دنیا مجھے دُنیا نیا معلوم ہوتی ہے

رُباعیات

عُسرت کا گلہ دل سے کیے جاتے ہیں — جینے کی جو پوچھو تو جیے جاتے ہیں
ملتا نہیں اے عرشؔ جو کچھ پینے کو — ہم جام ہی دھو دھو کے پیے جاتے ہیں

فردوس کے چشموں کی روانی پہ نہ جا ای شیخ تو جنت کی کہانی پہ نہ جا
اس وہم کو چھوڑ اپنے بڑھاپے ہی کو دیکھ حورانِ بہشتی کی جوانی پہ نہ جا

ایمن کا نور اگر ہے تو میری وطن میں ہے ابتک بھی شانِ طوراس اُجڑے چمن میں ہے
دونوں ہیں تیری یاد میں آلودۂ غرض جو عیب شیخ میں ہے وہی برہمن میں ہے

"میں کیوں بھول جاؤں"

(صرف دو بند درج کئے ہیں)

وہ سانسوں کی تیزی وہ سینہ کی دھڑکن وہ دونوں کا چھپ چھپ کے آنسو بہانا
وہ تجدیدِ اُلفت کے سو سو بہانے وہ اک دوسرے سے یونہی روٹھ جانا
تو ہی مجھ سے کہدے میں کیوں بھول جاؤں

سوالوں کا طومار مبہم زباں میں مگر رازِ دل کا نہ اظہار کرنا
نگاہیں ملانے میں تو اک جھجک سی مگر دل ہی دل میں مجھے پیار کرنا
وہ عرضِ محبت پہ معصوم و عارے وہ لکنت زباں کی وہ اقرار کرنا
تو ہی مجھ سے کہدے میں کیوں بھول جاؤں

بیتاب

جگیشور ناتھ نام، بیتاب تخلص، آپ کا وطن بریلی ہے، ۱۸۹۱ء آپ کی تاریخ پیدائش ہے، آجکل بریلی میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری آپ کو اپنے آبا و اجداد سے ترکہ میں ملی ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ رائے بیجناتھ صاحب شوق آنجہانی سابق سیرمنشی سرکار اودھ صاحب دیوان تھے، آپ کے برادر بزرگ بابو راجیشور ناتھ زیبا آنجہانی بھی شعر و شاعری میں بدرجہ کمال شغف رکھتے تھے۔ یہ زیبا ہی کی صحبت کا فیض تھا کہ بیتاب بھی شعر و شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ حضرت برق دہلوی کے آپ شاگرد تھے۔ آپکا خیال ہے کہ آپ مستقل طور پر اپنی مادری زبان "اردو" کی خدمت کریں، مگر چند وجوہ کی بنا پر مجبور رہیں آپ صرف اردو کے نظم گو شاعر ہی نہیں ہیں، بلکہ ہندی کے ایک مشہور مصنف بھی ہیں، چنانچہ آپنے ہندی میں بھی ناول لکھا، آپکی نظمیں اکثر ہندوستان کے متعدد رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ زمانہ میں آپنے بکثرت نظمیں شائع کرائی ہیں۔ آپ کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

لڑکپن

اُڑا ارنگِ طفلی شباب آتے آتے
گری دل پہ بجلی شراب آتے آتے

جوانی کی کافر ہوا جو نہی سنکی
ہوا ہو گئیں شوخیاں بھولے پن کی

جھجکنے لگیں اب وہ پہلی ادائیں
بدلنے لگیں رنگ اپنا فضائیں

حیا سے حجاب آشنا ہو رہی تھیں
تبسم میں جو بجلیاں سو رہی تھیں

زمانے میں پلٹا لیا دم زدن میں
تھی ڈوبی ہوئی سادگی بانکپن میں

دبے پاؤں دل سے مرے آہ نکلی
تڑپتی ہوئی اک دعا دل سے نکلی

نئی حسرتوں نے اُمنگوں نے گھیرا
دل موجزن کی ترنگوں نے گھیرا

حسیں چٹکیاں لیں جواں آرزو نے — کھلا وا دیا نشۂ رنگ و بو نے
اُلجھتا رہا خوب کانٹوں سے دامن — قفس کی اسیری میں تھی سیرِ گلشن
فریبِ نظر اک تقاضائے سِن تھا — مقدر میں اپنے لکھا یہ بھی دن تھا
ہوا آنکھوں آنکھوں میں اصرارِ بیہم — کہ ہو نذرِ اُلفت محبت مجسّم
شب و روز جب خلوتوں نے ستایا — مجھے عہدِ طفلی بہت یاد آیا
مگر جذبِ صادق بیا رنگ لایا — پھر آیا مرا عہدِ رفتہ پھر آیا
سمٹ آئی تنویر شمس و قمر کی — نظر آئی تصویر لختِ جگر کی
چراغِ تمنا ہوا گھر میں روشن — مجھے مل گیا میرا پیارا الگ کین

معلّم

تخلیق سے فارغ ہوا جب خالقِ باری — اور جوئے کرم خلد میں یکسر ہوئی جاری
بُلوائے گئے سامنے سب نوری و ناری — بخشیں یدِ قدرت نے اُنھیں نعمتیں ساری
اُٹھوائے گئے لعل و گہر بندۂ زر سے
سینہ ترا معمور کیا علم و ہُنر سے

مال و متاعِ دہر جو پایا تھا کسی نے — تن پروری میں اپنی اُڑایا تھا کسی نے
یا شوق سے دامن میں چھپایا تھا کسی نے — غیروں پہ تو ہرگز نہ لُٹایا تھا کسی نے
ہمّت سے تو نے اپنی عجب کام کر دیا
منھ موتیوں سے اہلِ ضرورت کا بھر دیا

ہے فیضیاب در سے ترے ساری خدائی — انساں وہ نہیں جس کو نہ ہو بہرہ پرائی
حصّہ میں ازل سے ہے ترے عقدہ کشائی — کھاتے ہیں فرشتے بھی غمِ ناصیہ سائی
کم ظرف کبھی صاحبِ ہمّت نہیں ہوتا
انساں کوئی دولت کی بدولت نہیں ہوتا

صد غیرتِ گلزار ہے ہستی ترے دم سے — احساں جو کیے تو نے وہ لیجیے کوئی ہم سے

جنبش جو ہوئی پھول جھڑے نوکِ قلم سے حوریں لئے حاضر ہوئیں گل باغ ارم سے

دستِ کرم نے تیرے گہر رول لئے ہیں
قربانیوں نے دونوں جہاں مول لئے ہیں

دُنیا میں نورِ علم کا دریا بہا دیا تاریکی جہل کا نشاں تک مٹا دیا
آنکھوں سے کذب و کفر کا پردہ اُٹھا دیا پُتلے تھے خاک کے جنہیں انساں بنا دیا

رتبہ زمیں کا چرخ سے دو با لا کر دیا
ہر ذرہ کہہ رہا ہے انا العرش بر ملا

بتیاب ایک ناظم کی حیثیت سے بہت کامیاب شاعر ہیں، تخیل کی بلند پروازی قابلِ تعریف ہے، کیونکہ اس میں وہ بے اعتدالی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ بعض بعض جگہ کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی مشق کی اور ضرورت ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم بہت کافی ہے۔ رنگِ تغزل سے آپ بالکل علٰحدہ ہیں۔ آپ اپنی نظموں کے لئے وہ موضوع انتخاب کرتے ہیں جو ہماری روزانہ زندگی سے متعلق ہیں۔ ترقی کی چند خصوصیات آپ کے کلام میں بھی نمودار ہو گئی ہیں۔ تاثیر فصاحت اور سلاست آپ کے کلام کا جزو ہو گئی ہیں۔

تاجور

تاجور (سامری) تخلص۔ ۱۵ مئی ۱۹۱۷ء میں بمقام لائل پور پیدا ہوئے ان کے والد کا نام پنڈت کرپا رام لاغر تھا، پولیس میں ہیڈ کانسٹبل تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کی تحریک عدم تعاون میں ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ اسی وجہ سے تاجور کی تعلیم خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ شاعری ان کی خاندانی میراث ہے۔ ان کے دادا پنڈت جوالا داس ساغر مرحوم فارسی کے جیّد فاضل اور شاعر بے بدل تھے۔ تیرہ ۱۳ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلے پنجابی زبان میں کہی اور سال بھر کے بعد سنہ ۱۹۳۱ء میں اردو زبان میں مستقل طور سے شعر کہنے لگے۔ اس زمانہ کا ان کا ایک شعر یہ ہے

ان کو دیکھا تو کہا اے لو نکل آیا ہے چاند
اور وہ نادان سوئے آسماں دیکھا کئے

مگر ان کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی بہ نسبت ان کی طبیعت کا لگاؤ نظم سے زیادہ ہے۔ پنڈت برج موہن کیفی دتاتریہ سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔

انتخاب کلام

(غزلوں سے)

دل کو جب وقف سوز و ساز کیا — اپنی ہستی پہ ہم نے ناز کیا
آنکھ طے کر چکی تھی راہِ نیاز — جب درِ جلوہ تونے باز کیا
شعلۂ حسن سے جو راکھ ہوئے — عشق نے اُن کو سرفراز کیا

رات بھر مری آنکھیں جستجو میں ٹھٹکا کیں — آسماں کے تاروں کو تیرا نقش پا جانا

تاجورؔ جیسے آنکھیں دیکھ کر نہیں سمجھیں ۔۔۔ دل نے اُس کا بے دیکھے آہ ماجرا جانا

محبت میں دلِ مضطر کو ہم بہلائے جاتے ہیں
کسی موہوم سی اُمید پہ غم کھائے جاتے ہیں
کبھی دن تھے کہ مذہب رہبرِ راہِ حقیقت تھا
مگر اس نام سے اب آدمی بہکائے جاتے ہیں

رہا غم عمر بھر بزمِ جہاں کی بے ثباتی کا
کسی سے عہد کیا بندھتا، کسی سے پیار کیا کرتے
کسی صورت تو آخر تاجورؔ یہ عمر کٹنی تھی
نہ کہتے شعر بھی اکثر تو ہم بیکار کیا کرتے

وہ زمانہ جب لہو کی مرے تن میں تھی روانی ۔۔۔ مجھے بھی ہوا تھا دھوکا کوئی شے ہو زندگانی
کھلی آنکھ جب جھپک کر وہ سماں نہ تاجورؔ تھا ۔۔۔ تھی قلانچ اک ہرن کی مرا خوابِ زندگانی

نظمیں

(اندھیری رات کے سناٹے میں)

رات اندھیری ہوا و تیرا سرار ۔۔۔ نبضِ فطرت کی سست ہو رفتار
ساکت و بے صدا ہو سازِ نمود ۔۔۔ ظلمتوں میں نہاں ہو رازِ نمود
تیرگی میں وہ جھنڈ پیڑوں کے ۔۔۔ دُھندلے دُھندلے خموش سائے سے
عالمِ ہُو فضا میں چار طرف ۔۔۔ ایک چُپ سی ہوا میں چار طرف
بہہ رہی ہو ندی، مگر خاموش ۔۔۔ منظرِ آب ہو سیاہی پوش
خامشی ہو کہ گائے جاتی ہو ۔۔۔ اپنا بربط بجائے جاتی ہو

راہیں جُب چاپ آہیں بھرتی ہیں ۔۔۔ دن کی کلفت کا شکوہ کرتی ہیں
اس خموشی میں ایک ٹیلے پر ۔۔۔ دیکھتا ہوں میں یہ حزیں منظر
آیا ایسی خموش خلوت میں ۔۔۔ سونی راتوں کی گہری ظلمت میں
دلِ مضطر کو یاد کس کی ہے ۔۔۔ جو مجھے گھر سے کھینچ لاتی ہے
کون ہے وہ ندیم تنہائی ۔۔۔ رُوح رہتی ہے منتظر جس کی

بے نیازی

جب تک میں تھا حقیقتِ دُنیا سے بیخبر ۔۔۔ آشفتہ اس کے عشق میں برسوں رہا کیا
وہ اپنے کبر و ناز میں مجھ سے کھنچی رہی ۔۔۔ میں اس کی آرزو میں ہمیشہ گھُلا کیا
اک مرتبہ بھی ان کو مگر پاسکا نہ یار ۔۔۔ گو سجدۂ نیاز میں برسوں جھکا کیا
اب جبکہ اصل روپ میں وہ آگئی نظر ۔۔۔ اب جبکہ بے نیازِ محبت ہوا ہوں میں
پھرتی ہے التفات کا ارماں لئے ہوئے ۔۔۔ حالانکہ دل سے محو اُسے کرچکا ہوں میں

سحر

اقبال بہادر ورما نام، سحر تخلص، وطن ہنگام ضلع فتح پور، ان کے والد کا نام منشی شیو نرائن جو اپنے قصبہ کے ایک باوقار اور سنجیدہ مزاج رئیس و زمیندار تھے۔ منشی صاحب گو خود شاعر نہ تھے، لیکن اردو علم و ادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ سحر نے بچپن میں مکتب میں اردو فارسی پڑھنا شروع کی۔ پھر انگریزی پڑھی اور ۱۹۰۲ء میں انگریزی مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا، مگر آگے تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ اسی دوران میں صحت خراب ہو گئی تھی۔ کئی سال تک علاج معالجہ کی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ۱۹۰۸ء میں صحت قدرے رو باصلاح ہوئی۔ ۱۹۰۹ء میں کالی داس کے مشہور و معروف ناٹک شکنتلا کا ترجمہ (مثنوی سحر) ختم کیا۔ اور اسی سال زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔

ابتدائے ۱۹۱۱ء سے زمانہ اور ادیب میں سحر کا کلام شائع ہونے لگا اور مدتوں شائع ہو کر مقبول ہوتا رہا۔ ۱۹۲۰ء سے پانچ سال کے مطالعہ کے بعد ہندی میں بھی لکھنے لگے۔ مگر زیادہ نثر لکھتے ہیں۔ عمر خیام کی تقریباً پانچ سو رُباعیوں کا ہندی نظم میں ترجمہ کیا، جسے انڈین پریس الہ آباد نے ۱۹۲۷ء میں بڑی سج دھج سے مصوّر شائع کیا۔

سحر دورِ حاضرہ کے ایک کہنہ مشق شاعر اور ایک مسلّم الثبوت ادیب ہیں۔ ان کے کلام میں ندرت، نازک خیالی، اور سوز کے اثرات موجود ہیں۔

نمونۂ کلام

(غزل)

کسی رنگ میں دلستانی نہیں ہے　　　کوئی شئے یہاں جاودانی نہیں ہے

ہے ٹھہراؤ بھی حرفِ فانی نہیں ہے
حقیقت ہے دُنیا کہانی نہیں ہے

خیالات کی شاد و آباد دُنیا
کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے

لہو ہے لہو سب یہ توبہ کا دل میں
سُبو میں مے ارغوانی نہیں ہے

عجب ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی
نری آگ ہے انمیں پانی نہیں ہے

یہ کیا ہو گیا ہائے قلب و جگر کو
کہ آنکھوں کی وہ ضوفشانی نہیں ہے

ارے مجھ میں چھپ کر یہ کیا کہہ رہے ہو
مری بات میری زبانی نہیں ہے

بھرے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے
یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

بسی دل میں ہے ایک دُنیا کہ جس میں
کہیں کوئی رازِ نہانی نہیں ہے

نہ جینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا
خوشی تو ہے جب زندگانی نہیں ہے

زمیں پر ہے پورا اثر آسماں کا
محبت نہیں، مہربانی نہیں ہے

سکت پائے جس سے نہ پیری نہ طفلی
جوانی وہ کوئی جوانی نہیں ہے

خدا خود میں ہے آپ اپنی نشانی
غلط ہے کہ اس کی نشانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحر ہے مشق کم کم
غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

بہار

اثر پذیر ہے اعجازِ جانفزائے بہار
دمِ مسیح سے کمتر نہیں ہوائے بہار

دل و جگر میں کھبی جاتی ہے ادائے بہار
ہوا ہے جلوہ فگن حسنِ خوشنمائے بہار

ہے لبکہ پھول وہی خود میں کیوں سمائے بہار
جہاں میں پھیل گئی نکہتِ ہوائے بہار

نئی نویلی سجاوٹ ہے باغِ عالم کی
عیاں ہے چار طرف رنگِ جلوہ زائے بہار

بنیں وہ فیضِ نمو سے نجوم و شمس و قمر
جو اپنے دامنِ رنگیں سے پھول اُڑائے بہار

یہ اعتدال کا موسم، یہ دلفریب سماں
یہ رنگ اور یہ اندازِ دلربائے بہار

جو کرنیں چھنتی ہیں یہ ہلکے ہلکے بادل سے
ہے دھوپ چھاؤں کی گویا بنی ردائے بہار

برس رہی ہو جوانی نگارِ قدرت پر
کہ بے حجاب ہوا اب حسنِ خود نمائے بہار

اُٹھا ہوا ہو حقیقت کا ہر طرف پردہ
کھلے ہوئے نظر آتے ہیں عقدہائے بہار

وہ دل نہیں ہو نہ ہو جسمیں عشقِ قدرت کا
وہ آنکھ کیا جو نہ ہو صورت آشنائے بہار

چہل پہل سی ہو اک کائنات میں پیدا
عیاں ہو عین خموشی میں بھی صدائے بہار

عجب نہیں جو زمانہ سے کفر ہو معدوم
بتانِ خود سر و خود بیں بھی ہیں فدائے بہار

ہر اک سماں میں تماشائے طرفہ ہو ظاہر
فنا کے رنگ میں مستور ہو بقائے بہار

رضائے حق پہ ہمیشہ جو شاد ہیں ای سحر
تو اُن کے واسطے کیا آئے یا نہ آئے بہار

کیفِ غم

کس قدر مرہونِ منت ہوں ترا ای کیفِ غم
مل رہی ہو تجھ سے کیا کیا لذتِ رنج و الم

ہو رہا ہو اک عجب احساس کا دل میں وفور
یعنی ہو جس طرح صہبا کا خمار آگیں سرور

جو خیال اُمید میں ہوتا ہو یا جو یاس میں
جذب ہو جاتا ہو وہ جا کر اسی احساس میں

جیسے دریا خوب دکھلاتا ہوا جوش و خروش
بحر سے ملتے ہی ہو جاتا ہو پھر یکسر خموش

جیسے نغمہ اُٹھ کے اپنی ہی بلند آواز میں
دل ہلا دیتا ہو اور ہوتا ہو گم پھر ساز میں

بس یہی حالت ہو میرے بھی نئے جذبات کی
یعنی اس دُنیائے متلوّن کی ہر ہر بات کی

جو مری رگ رگ میں پیدا کرکے ہلچل ایکبار
جلد ہی باقی ہو محویت کے عالم میں قرار

کیسی محویت؟ وہ محویت کہ جس کے جوش میں
بیخودی کی سی ہو کیفیت دلِ مدہوش میں

کیسی محویت؟ جو خود اپنے ہی دم سے ہو بنی
جو سراپا شدتِ احساسِ غم سے ہو بنی

وہ غمِ بیحد کہ جس سے حال ہوتا ہو زبوں
جو پھر اپنی ہی گرانباری سے پا جاتا ہو سکوں

وہ سکوں جسمیں مخل پھر کوئی ہو سکتا نہیں
ہاں خوشی تو کیا نہیں غم کی بھی گنجائش کہیں

اُس سکوں نے یہ اثر اپنا ہویدا کر دیا
اک توازن سا مرے باطن میں پیدا کر دیا

وہ توازن دل مرا جس کا تمنائی رہا
چھوڑ کر سب کچھ اُسی کا ہو وہ شیدائی بنا

بس مجھے اب ہر نفس اپنی ہی دُھن سے کام ہے
اور ہر آرام اُس میں گو عجب آرام ہے

فرطِ شادی سے کبھی آتے ہیں کبھی آنسو نکل
جس قدر ہوتا ہے اُنھیں رنج کا مخفی عمل

خیر جو کچھ ہے بہر حال اب غنیمت ہے وہی
بخشش ہو یا کرم مری تسکیں کی صورت ہے وہی

ہاں اُسی سے کرب کی حالت میں بھی آرام ہے
"کیفِ غم" اپنی زباں میں بس اسی کا نام ہے

منوّر

بشیشور پرشاد نام، وطن لکھنؤ، آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل کے لئے مشہور رہا ہے، چنانچہ آپ کے والد حضرت آنق مرحوم اور چچا حضرت تمنا لکھنوی نے اردو ادب کی تمام عمر خدمت کی، منور صاحب کے خسر جناب صدر مرحوم کو بھی فن تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا، خاندانی بزرگوں کے علاوہ منور صاحب کو حضرت نظر لکھنوی سے فیض حاصل کرنیکا بھی موقع مل چکا ہے۔ غرض منور صاحب نے شعر و سخن کے گہوارے میں پرورش پائی ہے۔ یوں بھی لکھنؤ کی فضا موسیقی اور شعریت سے معمور رہی ہے، منور صاحب جن کا کلام زمانہ اور ملک کے دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ "نسیم عرفاں" کے نام سے "شری بھگوت گیتا" کو اردو نظم میں منتقل کر چکے ہیں، جو مقبول عام ہو چکا ہے، اور اب "کائنات دل" میں آپنے اپنی سب نظمیں یکجا کر دی ہیں، ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے، اور یہ مختلف مضامین پر لکھی گئی ہیں، چنانچہ ہر شخص کو اپنی دلچسپی کے مطابق اس میں کافی نظمیں مل جائیں گی۔ منور صاحب کی شاعری ہندوستان کی موجودہ شاعری کا ایک پسندیدہ نمونہ ہے، آپنے حسن فطرت کی نقاشی کے ساتھ ساتھ قومی جذبات کی بھی بوجہ احسن ترجمانی فرمائی ہے۔

(ماخوذ از زمانہ دسمبر ۱۹۳۹ء)

محبت کا مذہب

نہ حاجت ہے اہلِ شریعت کی اس میں | نہ وقعت ہے راہِ طریقت کی اس میں
نہ حاجت کسی کی اطاعت کی اس میں | ضرورت نہ شغل و ریاضت کی اس میں

طریق پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

حدِ امکاں سے آگے اپنی حیرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی، نظر کی پابجولانی نہیں جاتی

لبِ خاموشِ ساحل سے سکوں کا درس ملتا ہو
مگر امواجِ دریا کی پریشانی نہیں جاتی

جہاں پہلے کبھی سب گوش برآواز رہتے تھے
وہاں بھی اب مری آواز پہچانی نہیں جاتی

حقیقت کچھ تو اپنی آبرو کا پاس ہو تجھ کو
ہزاروں پیرہن ہیں پھر بھی عُریانی نہیں جاتی

نہیں تعظیم کے لائق، نہیں تکریم کے قابل
وہ در جس کی طرف خود کھنچکے پیشانی نہیں جاتی

سکوں ہوتا تو ہو پھر بھی سکوں حاصل نہیں ہوتا
کہ جانے کی طرح اپنی پریشانی نہیں جاتی

میرے لئے اک موت ہو جنبش یہ نظر کی
تیرے لئے اک کھیل یہ گویا ہو نظر کا

کچھ اس کے سوا اور دکھائی نہیں دیتا
جو سامنے آنکھوں کے ہو پردا ہو نظر کا

ہر کافر و مومن ترے جلوہ پہ فدا ہو
کعبہ ہو یہ دل کا تو کلیسا ہو نظر کا

رُباعیات

ہر ذرّہ سے کسبِ نور کرتا ہوں میں
گردِ ظلمت کو دُور کرتا ہوں میں
دل ہی کو بناتا ہوں مقامِ معراج
سینے ہی میں سیرِ طور کرتا ہوں میں

دُنیا سے تعلق سے کنارا کرتے
دل کا یہ تلوّن نہ گوارا کرتے
رہتے جو ذرا ہوش ٹھکانے اپنے
ہستی و عدم میں سر نہ مارا کرتے



سورج نرائن نام، مہرؔ تخلص، دہلی کے باشندے ہیں، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ انگریزی کی طرف رجوع ہوئے اور اس کی تکمیل گورنمنٹ کالج لاہور سے کی۔ اس دوران میں آپنے سات زبانوں کی فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، سنسکرت سے آپ کو خاص طور پر رغبت تھی۔ یہی وجہ ہو کہ اُنھوں نے اس زبان میں ویدانت کا عمیق مطالعہ کیا اور اس سے خاطر خواہ استفادہ حاصل کیا، فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ محکمۂ سررشتہ تعلیم کی طرف سے پنجاب کے مختلف حلقوں میں نائب انسپکٹر مدارس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں کرنل ہالرائڈ نے آپ کو اردو کا ریویوئر مقرر کر دیا۔ ۱۹۰۵ء میں محکمۂ سررشتہ نے آپ کو کتب درسیہ لکھنے کے لئے مقرر کیا، اوائل عمر ہی سے آپ کو شعر و شاعری سے لگاؤ ہو گیا تھا، ابتدا میں رسالہ "گلدستہ ستر" میں آپ کی نظمیں شائع ہوتی رہیں، پھر رسالۂ زمانہ کانپور میں آپ کی غزلیں اور نظمیں پیش کی گئیں۔ رسالۂ سادھو ایک عرصہ تک آپ دہلی سے نکالتے رہے، اس میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "کلام مہرؔ" کے نام سے شائع ہو چکا ہو، نمونۂ کلام درج ذیل ہو۔

صدائے دوست

کیا شوقِ جانگداز کی کہانی سناؤں میں ۔۔۔ دل کس طرح سے کھول کے تجھ کو دکھاؤں میں

آتا ہو کون یاد تجھے کیا بتاؤں میں ۔۔۔ تو مجھ کو یہ بتا ترے قربان جاؤں میں

آواز کس کی تو نے اُڑائی ہوا سوار

بیخود ہوئے ہیں سن کے شہنشاہ اور گدا ۔۔۔ آہنگ کیا ہی مست ہو کیا دل فزا صدا

پوچھے جو کوئی مجھ سے کہوں گا یہی سدا باجے کو کب نصیب ہے یہ لحنِ خوش ادا
کب چھیڑنے سے یوں مترنم ہوئے ہیں تار
آواز ایسی سنتا ہوں سن سن کے سامعیں لکڑی سے اور دھات سے نکلے کبھی ہے کہیں
مجھ کو قسم خدا کی صدا یہ تری نہیں پردہ نشیں مرا پسِ پردہ ہے جاگزیں
پردوں سے اسکے آتی ہے آواز خوشگوار
پردہ ہے مجھ سے کیا کہ میں ہوں مبتلائے دوست قربان اے جان ہے اور دل فدائے دوست
کر اکتفا نہ مجھ کو سنا کر نوائے دوست سنوائی جس طرح سے ہے تو نے صدائے دوست
دکھلا بھی دے کبھی مجھے ظالم جمالِ یار

ہمّت نہ ہارنا

بگڑا ہوا ہے کام تو اس کو سنوارنا ڈوبا ہوا ہے نام تو اس کو ابھارنا
پیچھے کوئی ہٹے تو نہ اس کو پکارنا تم آپ بڑھ کے دوستو میدان مارنا
ہمّت نہ ہارنا کبھی ہمّت نہ ہارنا
رستہ ہے زندگی کا کٹھن پر بڑھے چلو مانا خطر ہے آئیں سنبھل کر بڑھے چلو
منزل نظر کے سامنے ہے گر بڑھے چلو رحمت خدا کی تم پہ مقرر بڑھے چلو
ہمّت نہ ہارنا کبھی ہمّت نہ ہارنا
بیشک رکاوٹیں بھی یہاں بے شمار ہیں بے شبہ مشکلیں بھی جہاں میں ہزار ہیں
ہٹتے نہیں ہیں بڑھ کے جو مردانِ کار ہیں مردان کار ہی کے لئے کاروبار ہیں
ہمّت نہ ہارنا کبھی ہمّت نہ ہارنا
مشکل اگر ہے کام تو جی توڑ کر کرو اونچا اگر ہے بام کمر باندھ کر چلو
رستہ اگر کٹھن ہے تو سیدھے چلے چلو آساں ہر ایک بات ہے میری اگر سنو
ہمّت نہ ہارنا کبھی ہمّت نہ ہارنا
جھوٹوں کے پاس بھول کے جانا نہ تم کبھی اے دوستو بہانے بنانا نہ تم کبھی

ہمت کے وقت منھ کو چھپانا نہ تم کبھی ‏ محنت کے وقت جان چرانا نہ تم کبھی

ہمت نہ ہارنا کبھی ہمت نہ ہارنا

محنت میں اور کام میں باہم نباہ ہو ‏ محنت سے کام کیجئے تو واہ واہ ہو

دنیا میں تم کو گر طلبِ عز و جاہ ہو ‏ میری صلاح ہے عام گدا یا کہ شاہ ہو

ہمت نہ ہارنا کبھی ہمت نہ ہارنا

آئے ہو تم یہاں تو کرو تندہی سے کام ‏ اور کام وہ کہ جس سے ہو روشن تمہارا نام

اور نام وہ کہ لیں اُسے عزت سے خاص و عام ‏ ممکن ہے سب سنو تو سہی میر کا کلام

ہمت نہ ہارنا کبھی ہمت نہ ہارنا

خوابِ دُنیا

(ترجمہ)

ہے جہانِ گذراں خواب کا بالکل نقشہ ‏ دیدۂ حضرتِ انساں کے لئے دھوکا سا

شادمانی کا تبسم ہے کہ آنسو غم کا ‏ یہ بھی جھوٹا ہے جو میری سنو وہ بھی جھوٹا

یاں ہے جو چیز وہ سچی نہیں جز نامِ خدا

نام و شہرت کے یہ چمکارے بھی بالکل جھوٹے ‏ مثلِ نیرنگِ شفق ہم نے بدلتے دیکھے

عشق و اُمید ہے کیا حسن سمجھتے ہو کسے ‏ یہ وہ ہیں پھول چنے جائیں جو قبروں کے لئے

یاں ہے جو نور وہ قائم نہیں جز نورِ خدا

بحرِ طوفاں زدۂ دنیا میں ہیں ہم سرگشتہ ‏ موجِ غم میں ہے جہاز اپنا تھپیڑیں کھاتا

روشنی عقل کی ہے وہم کا یا چمکارا ‏ ان سے طوفاں کے سوا ہم نے نہ کچھ بھی دیکھا

یاں ہے جو شے وہ مسکن نہیں جز ذاتِ خدا

دو غزلیں

(۱)

باقی رہے نہ بوئے خودی بھی وہ لا شراب
عرفاں کے خم سے مجھ کو پلا ساقیا شراب

کیفی کو کیفِ عشق سے کرتی ہے باخبر
ہے راہِ معرفت کے لئے رہنما شراب

ساقی کے ساتھ بزم میں ہے لطفِ میکشی
ہے ورنہ سم کی طرح مجھے جانفزا شراب

توفیق دے خدا تو پلا اور پی کہ ہے
سرمایۂ مسرتِ لا انتہا شراب

عالم ہے رنگ و بو کا وہ حیرت سی ہے مجھے
شیشے میں ہے پری کہ بھری ساقیا شراب

توبہ کھلی ہے توبہ بے سود سے مجھے
جب ابرِ نو بہار رہا اور دل فزا شراب

گر وحدتِ وجود ہے مطلوب اس کو پی
کرتی ہے کالعدم صورِ ماسوا شراب

پیرِ مغاں کے فیض کو اے تہر دیکھنا
اہلِ فنا کے حق میں ہے آبِ بقا شراب

(۲)

تابِ نظارہ تجھے ہو دلِ شیدا کیونکر
دو بدو مہر سے ہو دیدۂ بینا کیونکر

بن بلائے کبھی للہ مرے گھر آجاؤ
میں بھی تو دیکھوں پلٹتا ہے نصیبا کیونکر

عشق اک پردہ نشیں سے ہے جتاؤں کس طرح
میرا چارہ کریں احباب و اطبا کیونکر

شوقِ نظارہ یہاں اور وہ بت پردہ نشیں
میں ہوں حیران کہ حل ہوگا یہ عقدا کیونکر

بیقراری ہے مجھے ان کا تغافل ہے شعار
ہم نشیں دیکھئے واں جمتا ہے نقشا کیونکر

حسن کا خاصہ ہے جلوہ فروشی اے تہر
پھر پسند آیا ہے اس شوخ کو پردا کیونکر

رباعیات

افسوس کہ کچھ نیک کمائی نہ ہوئی
آئینۂ قلب کی صفائی نہ ہوئی

ظلمت کا حجاب ہی رہا پیشِ نظر
انوار کی کچھ جلوہ نمائی نہ ہوئی

گمراہ کو اپنے بس میں لانے کے لئے
دانے ہیں اس میں دل لبھانے کے لئے
تسبیح نہیں ہاتھ میں تیرے اے شیخ
دام تزویر ہے پھنسانے کے لئے

قہر کا کلام پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کلام زیادہ تر مسلسل ہوتا ہے، حتیٰ کہ وہ غیر مسلسل غزلیں بھی نہیں کہتے۔ دراصل قہر کی طبیعت غزل گوئی کے لئے موزوں نہیں معلوم ہوتی۔ خود انھوں نے تحریر کیا ہے کہ کبھی کبھی وہ غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انگریزی اور سنسکرت کا ان پر بہت گہرا اثر پڑا ہے، اکثر و بیشتر انگریزی نظموں کے ترجمے کئے ہیں، سنسکرت کی تشبیہات اور تمثیلات ان کے یہاں بکثرت موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ ویدانت کا فلسفہ انھوں نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے، مگر اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ انھوں نے اخلاقی اور نیچرل نظمیں بھی لکھی ہیں، بچوں کے لئے بھی نصیحت آمیز نظمیں "کلام قہر" میں موجود ہیں، منشی سدرشن گلدستۂ سخن میں یوں تحریر کرتے ہیں۔

"آپ کی شاعری حسن و عشق کی بندشوں سے قطعاً آزاد ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ شاعری حسن اخلاق کو جلا دینے کے لئے ہے، شہوانی جذبات کو بھڑکانے کے لئے نہیں۔ آپ کا کلام رنگین نہیں ہوتا، اس کا ایک ایک مصرع جادہ کے اثر میں تیر اور نہیں نکلتا۔"

بسمل

منشی سکھ دیو پرشاد سنہا نام، بسمل تخلص، الہ آباد کے باشندے ہیں، اور ایک معزز کالستھ خاندان کے چشم و چراغ، ان کا آبائی وطن موضع پھولانی پور ضلع رائے بریلی ہے، تقریباً اسّی سال ہوئے کہ ان کے جدامجد بسلسلۂ ملازمت الہ آباد تشریف لائے اور پھر یہاں کی خاک پاک ایسی دامنگیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے، اب اس خاندان کی مستقل سکونت الہ آباد ہی میں ہے، ان کی ابتدائی تعلیم ماڈرن ہائی اسکول اور کالستھ پاٹ شالہ کالج الہ آباد میں ہوئی لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر تعلیم تکمیل کو نہ پہونچ سکی۔ شعر و شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ اردو فارسی کی کتابیں بچپن ہی میں پڑھ لی تھیں اور چونکہ ان کے خاندان میں شعر و سخن کا چرچا تھا اس لئے ان کی طبیعت بھی اس ماحول میں خود بخود چلا آتی چلی گئی، ۱۹۱۸ء میں حضرت نوح ناروی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جناب نوح کو ان پر ناز ہے، اور یہ بھی اپنے شفیق استاد کی شان میں ہر مشاعرہ میں غزل پڑھنے سے پہلے ایک دو رباعیات ضرور پڑھتے ہیں۔ اس وقت بسمل کی عمر ۴۵ سال کی ہو گی، بہت خوش مزاج اور بذلہ سنج شاعر ہیں، جس مجمع میں تشریف فرما ہوتے ہیں توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں اشعار پڑھنے کا انداز بہت دلپذیر ہے۔ پہلا شعر پڑھتے پڑھتے مشاعرہ پر چھا جاتے ہیں۔

حضرت بسمل کی زندگی کا ایک حصہ ادب کی خدمت میں ہمیشہ بسر ہوا۔ رسالہ "طوفان" الہ آباد کے سب ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد رسالہ "چاند" (اردو) میں نظم کے حصہ کی ترتیب و تہذیب انھیں کے ذمہ تھی۔ ان کے کلام کا مجموعہ "جذباتِ بسمل" کے نام سے انڈین پریس الہ آباد نے بڑی

آب و تاب سے شائع کیا ہے، جس میں شیخ سر عبدالقادر کا مقدمہ درج ہے۔
اس مجموعہ میں پہلے رُباعیات ہیں، اس کے بعد نظمیں اور آخر میں غزلیں،
غزلوں کے بعض اشعار مصوّر بھی کئے گئے ہیں۔

رباعیات میں ایک خاص عنوان "فلسفۂ ہستی" ہے

آنکھیں ہوں تو دیکھے کوئی رازِ ہستی — دل ہو تو سنے نغمۂ سازِ ہستی
کرتے ہیں وضو آبِ فنا سے بسمل — ہوتی ہے ادا آج نمازِ ہستی

ہر موج ہے اک پردۂ سازِ ہستی — کھلنے کو حبابوں سے ہے رازِ ہستی
کوشش نہ اُبھرنے کی کرو اے بسمل — غرقابِ فنا ہو گا جہازِ ہستی

ان رُباعیات میں فلسفۂ ہستی کو بہت دلچسپ اور شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے ہستی کی ناپائداری کا نقشہ خوبصورت اور دلنشیں الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

ان رُباعیات کے بعد گیارہ نظمیں ہیں۔ اُن کے چند عنوانات یہ ہیں۔
(۱) سری کرشن (۲) جمنا جی (۳) مہاتما گاندھی (۴) برسات کی شام
(۵) مکالمہ صیاد و بلبل، "جمنا جی" کا ایک بند خاص طور سے دلچسپ ہے۔

پوچھے رادھا سے کوئی قدر حقیقت تیری — کرشن سے جانیے کوئی خوبیِ عزت تیری
ساری دُنیا میں ہے پھیلی ہوئی عظمت تیری — اسکو جنت ملی جس نے کی خدمت تیری
اپنا ہم رُتبہ جو پایا تجھے گنگا جی نے
اپنے پہلو میں بٹھایا تجھے گنگا جی نے

باعثِ ناز ہے بے شبہ ہمالا کے لئے — سببِ فخر و شرف گوکل و متھرا کے لئے
خاص اک نعمتِ حق وادیِ صحرا کے لئے — مختصر یہ ہے بڑی چیز ہے دُنیا کے لئے
دل کی سربستہ کلی فرطِ خوشی سے کھل جائے — اسکو امرت ملے جس کو ترا پانی مل جائے

"برسات کی شام" میں منظر کشی کی ایک عمدہ مثال یہ ہے ؎

سر اُٹھا کر آسماں کی جامہ زیبی دیکھئے | اسکی رنگینی میں کیا ہے دلفریبی دیکھئے
یہ ہم گرد دل پر ہوا ہے انجمن آرا کوئی | جھانکتا پردہ سے ہے شاید یہ سرپارا کوئی
میں نہ کیوں قربان جاؤں اس ادا اس ڈھنگ کے | آسماں پر کھل رہے ہیں پھول لاکھوں رنگ کے

بسمل کی غزلوں کو غور سے پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں سادگی، بیساختہ پن، اور صفائی کافی ہے۔ کہیں کہیں تصوف کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے، حسن و عشق کے راز و نیاز بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

لاکھ چھپائیے تو کیا چھپ نہ سکے گا رازِ عشق
بول اُٹھے گا خود بخود چھیڑیے بغیر سازِ عشق
فیصلہ دیکھیں کیا کرے حشر میں کارسازِ عشق
ایک طرف ہے نازِ حسن ایک طرف نیازِ عشق
حسن کی سب کرامتیں پیشِ نظر ہوں خود بخود
کعبۂ دل میں ہم پڑھیں دل سے اگر نمازِ عشق

پھولوں کے بارے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گلزار میں آیا موسم گل اللہ رے جوانی پھولوں کی
اب پھول کے بلبل کہتی ہے پھولوں سے کہانی پھولوں کی
گلشن میں نہ کیونکر دل بہلے وہ سنتے ہیں میں سناتا ہوں
پھولوں سے فسانہ بلبل کا، بلبل سے کہانی پھولوں کی
بلبل کے مقدر سے بیشک تقدیر اسی کی اچھی ہے
چل پھر کے صبا ہے چومتی ہے کیا کیا پیشانی پھولوں کی

چند اور اشعار بہت خوب ہیں۔

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے میں تو سمجھا لفظ لفظ
چپکے چپکے کہہ دیا سب کچھ تری تصویر نے

نہ آئی نیند، نہ آئی قضا، نہ آئے آپ
تڑپ تڑپ کے شبِ انتظار دیکھ لیا

نئے ادبی رجحانات

اُردو ادب سے دلچسپی اور اس موضوع سے لگاؤ رکھنے والوں کے لئے
کتاب نئے ادبی رجحانات بہت مفید ہے ۔۔۔۔۔۔ اہلِ قلم حضرات
کی رائیں ملاحظہ فرمائیے ۔

" اس کتاب میں ابتدائی اصلاحی دور سے لیکر اب تک اردو ادب کے نئے اضافوں کا
جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں پس منظر کے طور پر قدیم دور کے رجحانات اور اسکے
ادب پر مختصر تبصرہ ہے اس کے بعد نئے دور کے تغیرات، اس کے اسباب و نتائج اور
ادب کی نئی پیداواروں کو اختصار کے ساتھ دکھایا ہے، اس سلسلہ میں اس دور
کے پیدا شدہ لٹریچر کی تمام، بیشتر اکابر شعراء و مصنفین اور علمی و ادبی اداروں پر
مختصر تبصرہ آگیا ہے ۔" (معارف)

" یہ زمانہ قدامت پسندی کے خلاف جہاد کا زمانہ ہے اور ایک نوع کی بحرانی کیفیت
اہل قلم کے نوجوان طبقہ میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جوش اور اُبال
کے زمانہ کے لٹریچر کو سامنے رکھ کر کوئی معقول گفتگو کرنا آسان نہ تھا لیکن سید
اعجاز حسین صاحب نے جس خوبصورت اختصار کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال
کیا ہے وہ کامیاب ایجاز کی بہت اچھی مثال ہے، وہ حضرات جو تاریخ ادب کے مطالعہ
کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے یا مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت کا ارادہ رکھتے
ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے، کتاب و طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی
کافی دلکش ہے ۔" (نگار)

" اگرچہ اس سے قبل بھی دو ایک کتابیں اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں مگر وہ سرسری
اور ناقص ہیں، یہ کتاب جامع اور حاوی ہے، اس موضوع کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو
مصنف کی نظر سے بچا ہو وہ اس بات کے کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ کوئی اہم رجحان
نظر انداز ہونے نہیں پایا ۔" (اردو جولائی ۱۹۴۲ء) قیمت تین روپے آٹھ آنے

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ